यशवंतराव चव्हाण महाराष्ट्र ओपन युनिवर्सिटी
ज्ञानगंगा घरोघरी

Undergraduate Program
Ability Enhancement Courses (AEC) (MIL)
اردو نثر: زبان اور قواعد کا مطالعہ
Urdu Nasr: Zaban aur Qawaed ka Mutala (2CP)
Course Code: AECL206
Book Code: AECL2062

کتاب: دوم

Book: 02

غیر افسانوی نثر کا مطالعہ

Ghair Afsanvi Nasr ka Mutala

مصنف : ڈاکٹر اطہر حسین

اکائی 1 : زبان گویا، الطاف حسین حالی
اکائی 2 : سچ اور جھوٹ کا رزم نامہ، محمد حسین آزاد
اکائی 3 : جھینگر کا جنازہ، خواجہ حسن نظامی
اکائی 4 : میر ناصر علی، شاہد احمد دہلوی

Yashwantrao Chavan Maharashtra Open University, Nashik

Vice-Chancellor: Prof. Sanjeev Sonawane

Director : Prof. Nagarjun Wadekar, School of Humanities and Social Sciences

School Council, School of Humanities and Social Sciences

Prof. Nagarjun Wadekar (Chairman)
Director, School of Humanities
and Social Sciences,
Y.C.M. Open University,
Nashik (MS)

Prof. Jaideep Nikam
Director and Senior Professor, School
of Continuing Education,
Y.C.M. Open University,
Nashik (MS)

Prof. Shivaji Sargar
Director, Distance and Online
Education Centre, University of
Mumbai, Vidyanagari,
Kalina, Mumbai (MS)

Prof. Prakash Pawar
Head, Department of Political Science,
Shivaji University, Vidyanagar,
Kolhapur (MS)

Prof. Rajendra Kumbhar
(Retired) Head, Department of
Library and Informatics, Savitribai
Phule Pune University,
Ganeshkhind Road, Pune (MS)

Prof. Sanjay Tambat
Head, Department of
Communication and Journalism,
Savitribai Phule Pune
University,
Ganeshkhind Road, Pune (MS)

Prof. Chetana Kamalaskar
Director, School of Science,
Y.C.M. Open University,
Nashik (MS)

Prof. Sandeep Chaudhary
Head, Department of Sociology,
Saraswati Bhuvan College, Saraswati
Colony, Aurangpura, Chhatrapati
Sambhajinagar (MS)

Prof. Devendra Ingale
Head, Department of History,
Moolji Jaitha College
(Autonomous), Jalgaon (MS)

Dr. Latika Gaikwad
Associate Professor,
School of Commerce and Management,
Y.C.M. Open University,
Nashik (MS)

Dr. Subhash Sonune
Assistant Professor,
School of Education,
Y.C.M. Open University,
Nashik (MS)

Programme Advisory Committee (PAC)

Prof. Nagarjun Wadekar (Chairman)
Director, School of Humanities and
Social Sciences,
Y.C.M. Open University,
Nashik (M.S.)

Prof. Mohammad Shahid Husain
Former Chairman,
Centre of Indian Languages,
School of Language, Literature and
Culture Studies, JNU, New Delhi

Prof. Mohd. Moazzamuddin
Department of Education in
Languages, NCERT,
Sri Aurobindo Marg,
New Delhi

Prof. Mohd. Mahfooz Khan
(Ahmad Mahfooz)
Head, Department of Urdu,
Jamia Millia Islamia,
New Delhi

Prof. Abu Shaheem Khan
Department of Urdu,
Maulana Azad National Urdu
University, Hyderabad, (T.S.)

Prof. Shah Alam
Department of Urdu,
Jamia Millia Islamia,
New Delhi

Prof. Sardar Pasha
Head, Department of Urdu,
Azad Mahavidyalaya,
Ausa Latur (M.S.)

Prof. Quazi Naweed A. Siddiqui
Head, Department of Urdu,
Maulana Azad College,
Sambhajinagar (M.S.)

Dr. Pervez Ahmed
Associate Professor,
Centre of Indian Languages,
JNU, New Delhi

Dr. Abu Omair (Omair Manzar)
Associate Professor,
Department of Urdu,
Maulana Azad National Urdu University,
Lucknow Campus, Lucknow

Dr. Abdullah Imteyaz Ahmad
Associate Professor and Head,
Department of Urdu,
University of Mumbai, Mumbai

Dr. Wazhul Qamar Siddiqui
Assistant Professor,
Department of Urdu,
University of Mumbai, Mumbai

Course Code : AECL206, Book Code: AECL2062, Book Title: Ghair Afsanvi Nasr ka Mutala

Yashwantrao Chavan Maharashtra Open University

Vice Chancellor : Prof. Sanjeev Sonawane

Director: Prof. Nagarjun Wadekar, School of Humanities and Social Sciences

Writer

Dr. Athar Husain
Maulana Azad National Urdu University
Gachibowli Hyderabad
Telangana State-500032

Editor

Dr. Abu Omair (Omair Manzar)
Associate Professor, Department of Urdu,
Maulana Azad National Urdu University,
Lucknow Campus, Daliganj, Lucknow-206020

Review Committee

Prof. Ahmad Khan
Centre for Urdu Culture Studies,
Maulana Azad National Urdu University,
Gachibowli Hyderabad-500032

Prof. Sayyed Zakir Ali
Ex. Principal Kohinoor College Khudabad
Plot No. 04, Near Madarsa Anwar ul uloom
Almas colony, Mehrun, Jalgaon -425003 (M.S)

Dr. Sanjay Kumar
Associate Professor and Head
Department of Urdu, University of Allahabad
Prayagraj, Uttar Pradesh-211002

Dr. Ansari Masood Akhtar
Associate Professor and Head
Department of Urdu,
MSS's Ankushrao Tope College, Jalna (M.S.)

Dr. Anwaruddin
Associate Professor , Department of Urdu
Govt. Degree College for Women
Husaini Alam, Hyderabad-500046

Dr. Abdurrab
Associate Professor,
Department of Urdu, Maulana Azad College
Chhatrapati Sambhajinagar, Maharashtra-431001

Programme Coordinator

Dr. Rasheed Ashraf Khan
Academic Coordinator (Assistant Professor)
School of Language, Literature and Culture Studies
YCMOU, Nashik

IT & Language Editor

Dr. Rasheed Ashraf Khan
Academic Coordinator (Assistant Professor)
School of Language, Literature and Culture Studies
YCMOU, Nashik

Production

Mr. Vilas Badhan
Head, (Act.) Print Production Centre, YCMOU, Nashik

© 2026 Yashwantrao Chavan Maharashtra Open University, Nashik

☆ **First Edition:** December, 2026 **Publication No.:**
☆ **Proof Reader:** Mr. Azmatullah Siddiqui
☆ **Printed by:**
☆ **Published by :** Registrar, Yashwantrao Chavan Maharashtra Open University, Nashik

ISBN:

اردو نثر: زبان اور قواعد کا مطالعہ (AECL206)

کورس کی ساخت

کتاب اول: افسانوی نثر کا مطالعہ

اکائی 1 : سیر پہلے درویش کی: باغ و بہار، میر امن دہلوی

اکائی 2 : عیدگاہ؛ پریم چند

اکائی 3 : جامن کا پیڑ؛ کرشن چندر

اکائی 4 : ٹوبہ ٹیک سنگھ؛ سعادت حسن منٹو

کتاب دوم: غیر افسانوی نثر کا مطالعہ

اکائی 1 : زبان گویا، الطاف حسین حالی

اکائی 2 : سچ اور جھوٹ کا رزم نامہ، محمد حسین آزاد

اکائی 3 : جھینگر کا جنازہ، خواجہ حسن نظامی

اکائی 4 : میر ناصر علی، شاہد احمد دہلوی

کتاب2 : غیرافسانوی نثر کا مطالعہ (AECL2062)

کتاب کا تعارف

زیرِنظر کتاب ''غیرافسانوی نثر'' کا مطالعہ کے عنوان سے ہے، اس کتاب جس کا بنیادی مقصد غیرافسانوی نثر کے اہم نمونوں کا فنی، لسانی اور معنوی مطالعہ فراہم کرنا ہے۔ کتاب کو چار اکائیوں میں تقسیم کیا گیا ہے اور ہر اکائی میں نہ صرف منتخب مضمون کا فنی تجزیہ پیش کیا گیا ہے بلکہ زبان کی بنیادی مہارتوں اور قواعد زبان کو بھی سادہ اور واضح انداز میں شامل کیا گیا ہے، تاکہ طلبہ بیک وقت مطالعہ، زبان فہمی اور قواعد کی عملی مشق کر سکیں۔

پہلی اکائی ''زبان گویا'' (الطاف حسین حالی) پر مشتمل ہے، جس میں مضمون کا فنی تجزیہ کیا گیا ہے۔ اس اکائی میں زبان کی مہارتوں میں سے سننے (Listening) کی اہمیت کو اجاگر کیا گیا ہے۔ قواعد زبان کے تحت اسم اور ضمیر کی تعریف اور اقسام بیان کی گئی ہیں، جبکہ مختلف مثالوں کے ذریعے اسم، فعل، فاعل، مفعول، ضمیر، صفت، محاورے اور روزمرہ کی شناخت کی مشق بھی شامل ہے۔ دوسری اکائی میں ''سچ اور جھوٹ کا رزم نامہ'' (محمد حسین آزاد) شامل ہے۔ اس اکائی میں غیرافسانوی نثر کے اس منفرد مضمون کا فنی تجزیہ پیش کیا گیا ہے اور زبان کی مہارت پڑھنے (Reading) کی اہمیت پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ قواعد کے حصے میں صفت کی تعریف اور اقسام کو شامل کیا گیا ہے، ساتھ ہی ایسے جملے بھی دیے گئے ہیں جن کے ذریعے طلبہ صفت کی درست پہچان کا عملی تجربہ حاصل کر سکیں۔

تیسری اکائی ''جھینگر کا جنازہ'' (خواجہ حسن نظامی) پر مبنی ہے۔ اس اکائی میں فنی تجزیے کے ساتھ ساتھ زبان کی مہارت لکھنے (Writing) کی افادیت بیان کی گئی ہے۔ قواعد میں فعل اور فاعل کی وضاحت دی گئی ہے، جبکہ طلبہ کی مشق کے لیے شناختی جملے بھی شامل کیے گئے ہیں۔ چوتھی اکائی ''میر ناصر علی'' (شاہد احمد دہلوی) پر مشتمل ہے، جس میں غیرافسانوی نثر کے اس اہم نمونے کا فنی تجزیہ پیش کیا گیا ہے۔ زبان کی مہارت بولنے (Speaking) کی اہمیت کو واضح کیا گیا ہے۔ قواعد کے حصے میں مفعول کی تعریف، اقسام اور مثالیں شامل ہیں تاکہ طلبہ نحوی ساخت کو بہتر طور پر سمجھ سکیں۔

ہر اکائی میں مصنف کا مختصر تعارف شامل کیا گیا ہے اور ہر موضوع کے آخر میں قواعد کی شناخت اور زبان کی مشق کے لیے جملے دیے گئے ہیں۔ اس کے علاوہ، طلبہ کی لسانی صلاحیتوں کو مزید نکھارنے کے لیے اردو سے انگریزی اور انگریزی سے اردو ترجمے کی مشق بھی فراہم کی گئی ہے۔ یہ کتاب غیرافسانوی نثر کے مطالعے کو نہ صرف دلچسپ بناتی ہے بلکہ زبان کی چاروں مہارتوں سننا، پڑھنا، لکھنا اور بولنا کے تدریجی فروغ میں بھی مؤثر کردار ادا کرتی ہے۔ مجھے امید ہے کہ یہ مجموعہ طلبہ کو صحت مند مطالعہ، بہتر زبان دانی اور گہرے فہم کی طرف رہنمائی فراہم کرے گا۔

طلبا کی سہولت کے پیشِ نظر ہر اکائی کے درمیان خود اکتسابی سوالات اور اکائی کے آخر میں اس کے جوابات دیے گئے ہیں۔ تاکہ طلبہ اپنی معلومات کی جانچ خود کر سکیں۔ اس کے علاوہ مشقی سوالات بھی ہیں اور مشکل الفاظ کے معنی بھی درج کیے گئے ہیں۔ کتاب کے آخر میں مزید مطالعہ کے لیے موضوع سے متعلق اہم کتابوں کے نام بھی درج ہیں تاکہ طلبہ ان کتابوں سے مزید استفادہ کر سکیں۔

اکائی 1 : زبان گویا، الطاف حسین حالی

ساخت

1.0 مقاصد

1.1 تمہید

1.2 موضوع کی وضاحت

1.2.1 متن: زبان گویا

1.2.2 زبان گویا کا فنی تجزیہ

خود اکتسابی کے لیے سوالات I

1.2.3 زبان کی مہارتیں: زبان گویا کے حوالے سے سننے (Listening) کی اہمیت

1.2.4 قواعد: اسم اور ضمیر

خود اکتسابی کے لیے سوالات II

1.3 الفاظ اور معنی

1.4 خود اکتسابی سوالات کے جوابات I

خود اکتسابی سوالات کے جوابات II

1.5 خلاصہ

1.6 خود اکتسابی کے لیے مشق

تحریری سرگرمیاں: قواعد کی شناخت

کام کا تجربہ: ترجمہ

1.7 مشقی سوالات

1.8 مزید مطالعے کے لیے کتب

1.0 مقاصد

اس اکائی کے مطالعہ کے بعد طلبا سے توقع کی جاتی ہے کہ وہ.....

- ☆ الطاف حسین حالی کی سوانح اور ان کے ادبی پس منظر سے واقف ہو سکیں گے۔
- ☆ زبان گویا کے متن کا فنی تجزیہ کر سکیں گے۔
- ☆ زبان گویا کے متن کے ذریعے زبان کی اہمیت کو بہتر طور پر سمجھ سکیں گے۔
- ☆ زبان گویا کے بنیادی خیالات کو جان سکیں گے۔
- ☆ زبان کی مہارت، سننا کی اہمیت زبان گویا کے حوالے سے بیان کر سکیں گے۔
- ☆ قواعد کی مشقوں کے ذریعے زبان کی ساخت کو سمجھ سکیں گے۔
- ☆ اسم اور ضمیر کی تعریف، اقسام اور عملی مثالوں سے آگاہی حاصل کریں۔
- ☆ جملوں میں اسم، صفت، فعل، فاعل اور مفعول کی شناخت کر سکیں۔
- ☆ اردو سے انگریزی اور انگریزی سے اردو ترجمے کی ابتدائی مشق کر سکیں گے۔

1.1 تمہید

اکائی اول کا عنوان ''زبان گویا، الطاف حسین حالی'' ہے جو اردو کے معروف ادیب، شاعر اور نقاد الطاف حسین حالی کی تحریر ہے۔ الطاف حسین حالی اردو ادب کی تاریخ میں ایک سنگ میل کی حیثیت رکھتے ہیں جنہوں نے شعر و نثر دونوں میں فکری بالیدگی اور ادبی شعور کو نئی سمت عطا کی۔ ان کی شخصیت میں ایک مصلح، مفکر اور فنکار کا خوبصورت امتزاج نظر آتا ہے۔ اس اکائی میں ہم ابتدا میں حالی کی زندگی اور ان کے ادبی سفر کا مفصل تعارف پیش کریں گے تاکہ طلبہ نہ صرف ان کی شخصیت سے واقف ہو سکیں بلکہ اس دور کی ادبی اور سماجی پس منظر کو بھی سمجھ سکیں جس میں حالی نے اپنی تحریریں لکھیں۔ اس تعارف کا مقصد طلبہ کو ادیب کے پس منظر سے مربوط کرنا ہے تاکہ ان کا مضمون ''زبان گویا'' زیادہ بامعنی اور گہرا محسوس ہو۔ ''زبان گویا'' کے متن کی قرات کے ذریعے طلبہ کو موقع دیا جائے گا کہ وہ خود اس نثری مضمون کی زبان، اسلوب اور موضوع کو محسوس کریں اور اس کے فکری پہلوؤں پر غور و فکر کریں۔ اس کے بعد مضمون کے فنی تجزیے کے ذریعے ہم اس کی ساخت، بیانیہ انداز، ادبی حسن اور زبان کی تاثیر کو جانچیں گے تاکہ طلبہ غیر افسانوی نثر میں مہارت حاصل کریں۔

اس اکائی میں زبان کی چار مہارتوں میں سے خاص طور پر سننے کی مہارت پر روشنی ڈالی گئی ہے، جو آج کے دور میں موثر رابطے کے لیے لازمی ہے۔ ہم ''زبان گویا'' کے متن کی مدد سے طلبہ کو سننے کی اہمیت اور اس کے عملی استعمال سے آشنا کریں گے اور طلبہ کو بتایا جائے گا کہ "زبان گویا" کے متن کی روشنی میں سننے کی مہارت کیوں ضروری ہے۔ علاوہ ازیں، اس اکائی میں قواعد کے بنیادی موضوعات جیسے اسم اور ضمیر کی تعریف اور اقسام مثالوں کے ذریعے وضاحت کی جائے گی تاکہ طلبہ زبان کی ساخت کو بہتر طور پر سمجھ سکیں۔ طلبہ کے لیے خود اکتسابی کی مشقیں بھی شامل کی گئی ہیں، جن میں مختلف جملوں کے ذریعے طلبہ کو اسم، صفت، فعل، فاعل، مفعول، محاورے اور روزمرہ کے الفاظ کی شناخت کرنی ہوگی۔ مزید برآں، اردو سے انگریزی اور انگریزی سے اردو ترجمے کی مشقیں بھی دی گئی ہیں تاکہ طلبہ دو زبانوں میں مہارت پیدا کریں اور اپنی زبانی و تحریری صلاحیتوں کو مزید بہتر بنا سکیں۔ یہ تمام سرگرمیاں طلبہ کی زبان، ادبی فہم اور قواعدی مہارتوں کو بہتر بنانے کے لیے ترتیب دی گئی ہیں تاکہ وہ غیر افسانوی نثر کے مطالعہ میں مہارت حاصل کر سکیں اور علمی و عملی دونوں لحاظ سے زبان پر عبور حاصل کر سکیں۔ یہ اکائی نہ صرف طلبہ کی ادبی بصیرت کو فروغ دے گی بلکہ ان کی زبان دانی، قواعدی معلومات اور ترجمے کی صلاحیتوں کو بھی نکھارے گی۔

الطاف حسین حالی کا تعارف:

الطاف حسین حالی اردو ادب کے ان عظیم شخصیات میں سے ہیں جنہوں نے نہ صرف ادب کو ایک نیا فکری اور جمالیاتی زاویہ دیا بلکہ اپنی قلمی خدمات کے ذریعے قوم کی فکری بیداری اور اصلاح میں بھی نمایاں کردار ادا کیا۔ انہیں اردو ادب کا اولین نقاد، جدید نظم کا بانی، صاحب طرز سوانح نگار اور مصلح قوم کے طور پر جانا جاتا ہے۔ حالی کی شخصیت اور فن کا دائرہ کار بہت وسیع تھا، جس میں انہوں نے نظم و نثر دونوں میں گراں قدر خدمات انجام دیں اور اردو تنقید کی بنیاد رکھی۔

الطاف حسین حالی 1837ء میں پانی پت میں پیدا ہوئے۔ ان کا اصل نام الطاف حسین تھا اور تخلص حالی تھا۔ محض نو سال کی عمر میں ان کے والد کا انتقال ہو گیا، جس کے بعد ان کے بڑے بھائی نے ان کی پرورش کی۔ حالی نے اپنی ابتدائی تعلیم پانی پت میں حاصل کی اور قابل ذکر بات یہ ہے کہ وہ حافظ قرآن بھی تھے۔ بچپن سے ہی ان کی ذہنی استعداد اور ادبی صلاحیتیں نمایاں تھیں۔ روزگار کی تلاش اور تعلیمی سفر کے لیے وہ دہلی چلے گئے، جہاں انہوں نے فارسی، عربی، فلسفہ، منطق، حدیث اور تفسیر کی کتابوں کا مطالعہ کیا۔ حالی کی تعلیمی کوششیں محض رسمی نہیں تھیں بلکہ ان کی محنت، شوق اور لگن کی بدولت انہوں نے ایک گہرا علمی ورثہ حاصل کیا۔ دہلی میں قیام کے دوران وہ معروف شاعر غالب کی خدمت میں حاضر ہوتے اور ان سے استفادہ کرتے تھے۔ البتہ شاعری کے استاد کے طور پر وہ میر کو ہی تسلیم کرتے تھے۔

الطاف حسین حالی کی ادبی خدمات بہت متنوع ہیں۔انہوں نے نظم ونثر دونوں میں درجنوں کتابیں تحریر کیں اور اردو ادب کو فکری اور فنکارانہ اعتبار سے نئی بلندیوں تک پہنچایا۔ان کا سب سے بڑا کارنامہ اردو تنقید کی بنیاد رکھنا ہے، جس کے لیے انہوں نے اپنی مشہور کتاب مقدمہ شعروشاعری لکھی، جو اردو تنقید کا پہلا منظّم اور علمی خاکہ ہے۔اس کتاب نے شاعری کے جمالیاتی اور فنی پہلوؤں پر نئی بحث کو جنم دیا اور اردو ادب میں تنقید کو ایک معتبر اور مؤثر میدان بنایا۔حالی کو جدید نظم کے بانی کے طور پر بھی یاد کیا جاتا ہے۔ان کی نظم مسدس مدو جزر اسلام، جو 1879 میں سرسید احمد خان کی ترغیب پر لکھی گئی، اردو ادب میں ایک انقلابی قدم تھی۔اس نظم نے مذہب، معاشرت اور تاریخ کے موضوعات کو نئے اسلوب اور فکر کے ساتھ پیش کیا۔قابل ذکر بات یہ ہے کہ سرسید نے اسے توشۂ آخرت قرار دیا تھا، جو حالی کے ادبی اور فکری مقام کا ایک ثبوت ہے۔حالی نے پنجاب کے محکمہ تعلیم کے ڈائریکٹر کرنل ہالرائڈ کی حمایت سے طرحی مشاعروں کی بنیاد رکھی، جس میں شعرا کو ایک خاص موضوع پر نظم پیش کرنے کا موقع دیا جاتا تھا۔اس تحریک نے اردو ادب کی ترویج اور شعری حسن کو بڑھاوا دیا۔حالی نے اپنی مشہور نظمیں حب وطن، برکھارت، نشاط امید اور مناظرہ رحم وانصاف خاص طور پر ان مشاعروں کے لیے تحریر کیں، جو ان کے فن اور فکری عہد کی عکاسی کرتی ہیں۔

حالی اردو کے ایک صاحب طرز سوانح نگار بھی تھے۔انہوں نے متعدد اہم سوانحی کتابیں تحریر کیں جن میں یادگار غالب (1897)، حیات سعدی (1882) اور حیات جاوید (1901) شامل ہیں۔ان تحریروں میں انہوں نے نہ صرف موضوعات کی جامع تحقیق کی بلکہ ادبی اور تاریخی حوالوں کے ذریعے شخصیات کی عکاسی کی، جس سے اردو ادب میں سوانح نگاری کا معیار بلند ہوا۔الطاف حسین حالی نے معاشرتی اصلاح کے لیے بھی بھرپور کام کیا، خاص طور پر خواتین کی تعلیم اور ان کے حقوق کے حوالے سے مجالس النسا کے نام سے ایک کتاب لکھی، جو قصہ کی صورت میں تھی۔اس کتاب پر وائسرائے نارتھ بروک نے انہیں چار سو روپے کا انعام بھی دیا۔علاوہ ازیں، حالی نے عورتوں کی ترقی اور حقوق کی حمایت میں اپنی شاعری کے ذریعے آواز بلند کی۔ان کی نظمیں مناجات بیوہ اور چپ کی داد اس حوالے سے اہم ہیں۔حالی نے ایک مدت تک دہلی کے اینگلو عربک اسکول میں مدرس کے طور پر خدمات انجام دیں۔1872 میں وہ پنجاب بک ڈپو میں ملازم مقرر ہوئے۔1904 میں حکومت نے ان کی ادبی خدمات کے اعتراف میں انہیں شمس العلما کا خطاب دیا۔

الطاف حسین حالی نے اپنی تحریروں کے ذریعے نہ صرف ادبی معیار بلند کیا بلکہ معاشرتی اصلاح کے لیے بھی کوششیں کی۔ان کا اسلوب سادہ، بلیغ اور مؤثر تھا، جو قاری کے دل ودماغ پر گہرا اثر چھوڑتا تھا۔حالی کی شاعری میں جذبہ حب الوطنی، امید، انصاف اور اصلاح کا پیغام نمایاں ہے۔ان کی نثر میں وضاحت، شگفتگی اور علمی گہرائی کے عناصر موجود ہیں، جس نے اردو ادب کو ایک جدید اور پختہ اظہار کا ذریعہ فراہم کیا۔الطاف حسین حالی کا انتقال 1914 میں ہوا البتہ ان کی ادبی اور فکری خدمات آج بھی اردو ادب کی دنیا میں زندہ اور تابندہ ہیں۔ان کی تصانیف، تنقیدی فکر اور شعری ورثہ آنے والی نسلوں کے لیے مشعل راہ ہے۔

1.2 موضوع کی وضاحت

1.2.1 متن: زبان گویا، الطاف حسین حالی

اے میری بلبل ہزار داستان! اے میری طوطئ شیوا بیان! اے میری قاصد! اے میری ترجمان! اے میری وکیل! اے میری زبان! سچ بتا، تو کس درخت کی ٹہنی اور کس چمن کا پودا ہے؟ تیرے ہر پھول کا رنگ جدا اور تیرے ہر پھل میں ایک نیا مزا ہے۔کبھی تو ایک ساحر فسوں ساز ہے جس کے سحر کا رد، نہ جادو کا اتار۔کبھی تو ایک افعی جاں گداز ہے جس کے زہر کی رد نہ کاٹے کا منتر۔تو وہی زبان ہے کہ بچپن میں کبھی اپنے ادھورے بولوں سے غیروں کا جی لبھاتی تھی اور کبھی اپنی شوخیوں سے ماں باپ کا دل دکھاتی تھی۔تو وہی زبان ہے کہ جوانی میں کہیں اپنی نرمی سے دلوں کا شکار کرتی تھی اور کہیں اپنی تیزی سے سینوں کو فگار کرتی تھی۔

اے میری زبان! دشمن کو دوست بنانا اور دوست کو دشمن کر دکھانا تیرا ایک ادنی کھیل ہے جس کے تماشے سیکڑوں دیکھے اور ہزاروں دیکھنے

باقی ہیں۔

اے میری بنی بات کی بگاڑنے والی! اور میرے بگڑے کاموں کی سنوارنے والی! روتے کو ہنسانا اور ہنستے کو رلانا، روٹھے کو منانا اور بگڑے کو بنانا، نہیں معلوم تو نے کہاں سیکھا؟ اور کس سے سیکھا؟ کہیں تیری باتیں بس کی گانٹھیں ہیں اور کہیں تیرے بول شربت کے گھونٹ ہیں، کہیں تو شہد ہے اور کہیں حنظل، کہیں تو زہر ہے اور کہیں تریاق۔

اے زبان! ہمارے بہت سے آرام اور بہت سی تکلیفیں، ہمارے سیکڑوں نقصان اور ہزاروں فائدے، ہماری عزت، ہماری ذلت، ہماری نیک نامی، ہماری بدنامی، ہمارا سچ، ہمارا جھوٹ، صرف تیری ایک ''ہاں'' اور ایک ''نہیں'' پر موقوف ہے۔ تیری اس ''ہاں'' اور ''نہیں'' نے کروڑوں کی جانیں بچائیں اور لاکھوں کے سر کٹوائے۔

اے زبان! تو دیکھنے میں تو ایک پارہ گوشت کے سوا کچھ نہیں مگر تیری طاقت نمونہ قدرت الٰہی ہے۔ دیکھ! اس طاقت کو رائیگاں نہ کھو اور اس قدرت کو خاک میں نہ ملا۔ راستی تیرا جوہر ہے اور آزادی تیرا زیور۔ دیکھ اس جوہر کو برباد نہ کر اور اس زیور کو زنگ نہ لگا۔ تو دل کی امین ہے اور روح کی ایلچی۔ دیکھ دل کی امانت میں خیانت نہ کر اور روح کے پیغام پر حاشیے نہ چڑھا۔

اے زبان! تیرا منصب بہت عالی ہے اور تیری خدمت نہایت ممتاز، کہیں تیرا خطاب کاشف اسرار ہے اور کہیں تیرا لقب محرم راز۔ علم کہ ایک خزانہ غیبی ہے اور دل اس کا خزانچی۔ حوصلہ اس کا قفل ہے اور تو اس کی کنجی۔ دیکھ اس قفل کو بے اجازت نہ کھول اور اس خزانے کو بے موقع نہ اٹھا۔ وعظ و نصیحت تیرا فرض ہے اور تلقین و ارشاد تیرا کام۔ ناصح مشفق تیری صفت ہے اور مرشد برحق تیرا نام۔ خبردار! اس نام کو عیب نہ لگانا اور اس فرض سے جی نہ چرانا، ورنہ یہ منصب عالی تجھ سے چھن جائیگا اور تیری بساط میں وہی ایک گوشت کا چھیچھڑا رہ جائیگا۔

کیا تجھ کو یہ امید ہے کہ تو جھوٹ بھی بولے اور طوفان بھی اٹھائے، تو غیبت بھی کرے اور تہمت بھی لگائے، تو فریب بھی کرے اور چغلیاں بھی کھائے اور پھر وہی زبان کی زبان کہلائے۔ نہیں! ہرگز نہیں!! اگر تو سچی زبان ہے تو زبان ہے ورنہ زبوں ہے بلکہ سراسر زیاں ہے۔ اگر تیرا قول صادق ہے تو شہدِ فائق ہے ورنہ تھوک دینے کے لائق ہے۔ اگر تو راست گفتار ہے تو ہمارے منہ میں اور دوسروں کے دلوں میں جگہ پائیگی ورنہ گدی سے کھینچ کر نکالی جائیگی۔

اے زبان! جنہوں نے تیرا کہنا مانا اور جو تیرا حکم بجالائے انہوں نے سخت الزام اٹھائے اور بہت پچھتائے۔ کسی نے انہیں فریبی اور مکار کہا۔ کسی نے گستاخ اور منہ پھٹ ان کا نام رکھا، کسی نے ریاکار ٹھہرایا اور کسی نے سخن ساز۔ کسی نے بدعہد بنایا اور کسی نے غماز، غیبت اور بہتان، مکر اور افترا، طعن اور تشنیع، گالی اور دشنام، پھکڑ اور ضلع جگت اور پھبتی۔ غرض دنیا بھر کے عیب ان میں نکلے اور وہ ان سب کے سزاوار ٹھہرے۔

اے زبان! یاد رکھ۔ ہم تیرا کہنا نہ مانیں گے اور تیرے قابو میں ہرگز نہ آئیں گے۔ ہم تیری ڈور ڈھیلی نہ چھوڑیں گے اور تجھے مطلق العنان نہ بنائیں گے۔ ہم جان پر کھیلیں گے پر تجھ سے جھوٹ نہ بلوائیں گے۔ ہم سر کے بدلے ناک نہ کٹوائیں گے۔

اے زبان! ہم دیکھتے ہیں کہ گھوڑا جب اپنے آقا کو دیکھ کر محبت کے جوش میں آتا ہے تو بے اختیار ہنہناتا ہے اور کتا جب پیار کے مارے بے تاب ہو جاتا ہے تو اپنے مالک کے سامنے دم ہلاتا ہے۔ سبحان اللہ! وہ نام کے جانور اور ان کا ظاہر و باطن یکساں۔ ہم نام کے آدمی اور ہمارے دل میں ''نہیں'' اور زبان پر ''ہاں''۔

الٰہی! اگر ہم کو رخصت گفتار ہے تو زبان راست گفتار دے اور اگر دل پر تجھ کو اختیار ہے تو زبان پر ہم کو اختیار دے۔ جب تک دنیا میں رہیں سچے کہلائیں اور جب تیرے دربار میں آئیں تو سچے بن کر آئیں۔ آمین۔ (ماخذ: مقالات حالی حصہ اول، دارالمصنفین شبلی اکیڈمی اعظم گڑھ، 1982)

1.2.2 زبان گویا کا فنی تجزیہ

مولانا الطاف حسین حالی نے مستقل تصنیف کے علاوہ درجنوں مضامین و مقالات تحریر کیے جو مقالات حالی کے عنوان سے دو حصوں میں

شائع ہو چکے ہیں۔ پہلے حصے میں علمی، ادبی اور اصلاحی مضامین شامل ہیں جبکہ دوسرے حصہ میں زیادہ تر تقریظیں وتقریریں ہیں۔ حالی کے اہم مضامین میں تدبیر، زمانہ، مزاح، بدگمانی، حسب ونسب، سرسید احمد خاں اور ان کا کام، الدین یسر اور تجارت کا اثر عقل واخلاق پر وغیرہ شامل ہیں۔ ان مضامین میں حالی نے معاشرتی، مذہبی، ادبی، اخلاقی اور اصلاحی موضوعات کو غیر معمولی بصیرت، سادگی اور زور بیان کے ساتھ پیش کیا ہے۔

مضمون نگاری بنیادی طور پر ایک ایسی ادبی صنف ہے جس میں مصنف کسی مخصوص موضوع پر اپنے خیالات، تجربات اور مشاہدات کو اس طرح ترتیب دیتا ہے کہ قاری کو ایک مربوط، مدلل اور فکری اکائی میسر آتی ہے۔ یہ محض بیان بازی یا معلومات کی ترسیل نہیں بلکہ ایک فکری ترتیب، منطقی ربط اور قاری سے ہم کلامی کا فن ہے۔ مضمون نگار ہمیشہ قاری کو مدنظر رکھتا ہے اور اپنے خیالات کے اظہار میں اس کی فہم، دلچسپی اور ذہنی سطح کا لحاظ رکھتا ہے۔ اس کے لیے وہ واقعات، مثالیں اور تمثیلات وغیرہ سے کام لیتا ہے تاکہ بات میں زور، دلیل میں پختگی اور بیان میں جاذبیت پیدا ہو۔ مضمون نگاری محض علم کی ترسیل نہیں بلکہ ایک ادبی عمل بھی ہے جس میں اسلوب، ترتیب، زبان اور تاثیر سبھی لازم ہوتے ہیں۔

مضمون نگاری دراصل فن اظہار ہے۔ اس میں مصنف کو یہ مہارت حاصل ہونی چاہیے کہ وہ مشکل سے مشکل بات کو سادہ، واضح اور دلکش انداز میں بیان کرے۔ ایک کامیاب مضمون نگار نہ صرف اپنے خیالات کو منظّم انداز میں پیش کرتا ہے بلکہ قاری کی دلچسپی کو آخر تک قائم رکھتا ہے۔ مضمون کا حسن اس کی روانی، ترتیب اور وضاحت میں پوشیدہ ہے۔ مضمون نگاری کے لیے ضروری ہے کہ موضوع کا انتخاب سوچ سمجھ کر کیا جائے، موضوع ایسا منتخب کیا جائے جو قاری کے لیے دلچسپی کا باعث ہو۔ مضمون معلوماتی، فکری یا تجزیاتی نوعیت کا ہونا چاہیے۔ خیالات میں منطقی ربط اور تسلسل ہونا ضروری ہے۔ زبان سادہ، بامحاورہ اور دلکش ہو۔ غیر ضروری طوالت سے پرہیز کیا جائے تاکہ مضمون جامع اور مؤثر بن سکے۔ ایک اچھے مضمون کے لیے چند شرطیں ضروری ہیں۔ وضاحت وصراحت سے بات کی جائے، ہر پیراگراف دوسرے سے مربوط ہو، قاری کی دلچسپی برقرار رکھی جائے، ذاتی تعصب یا جانب داری سے بچا جائے۔ مضمون کا اختتام ایسا ہو جو قاری پر دیرپا اثر چھوڑے۔

اردو میں باقاعدہ مضمون نگاری کی روایت کا آغاز انیسویں صدی میں علی گڑھ تحریک کے زیر اثر ہوا۔ سرسید احمد خان وہ پہلے شخص تھے جنہوں نے اس صنف کو اصلاح معاشرہ کے لیے استعمال کیا۔ انہوں نے مغربی طرز پر اسپیکٹیٹر اور ٹیٹلر جیسے انگریزی جرائد سے متاثر ہو کر تہذیب الاخلاق کے نام سے ایک رسالہ جاری کیا، جس میں اصلاحی مضامین شائع کیے جاتے۔ یہی اردو مضمون نگاری کی باقاعدہ بنیاد تھی۔ سرسید کے ساتھ ساتھ ان کے رفقاء جیسے مولانا محمد حسین آزاد، محسن الملک، شبلی نعمانی اور الطاف حسین حالی نے اس روایت کو نہ صرف اپنایا بلکہ اس میں فکری گہرائی اور ادبی حسن بھی پیدا کیا۔ چنانچہ اردو نثر میں مضمون نگاری نہ صرف ایک فکری وعلمی ذریعہ بن گئی بلکہ تہذیب واخلاق کا ایک طاقتور ہتھیار بھی۔

مولانا الطاف حسین حالی کی مضمون نگاری پر نظر ڈالی جائے تو یہ بات بآسانی محسوس ہوتی ہے کہ وہ اس صنف کے اسرار ورموز سے پوری طرح واقف تھے۔ ان کے یہاں موضوع کے انتخاب میں تنوع، اظہار میں سنجیدگی اور انداز میں سادگی وشگفتگی بدرجہ اتم موجود ہے۔ وہ نہایت فطری اور عقلی انداز سے بات کرتے ہیں اور اپنے دلائل میں صرف زور کلام یا خطابت کے بجائے فہم واستدلال سے کام لیتے ہیں۔ حالی کی نثر کا انداز نہ تو محض معلوماتی ہوتا ہے اور نہ ادبی بلکہ ان کی تحریر میں وہ توازن اور سلیقہ موجود ہے جو قاری کو متاثر کرتا ہے۔ ان کی نثر میں وضاحت، شفافیت اور فکر کی گہرائی ہوتی ہے۔ وہ ابتدا ہی میں اپنا نقطہ نظر واضح کر دیتے ہیں اور پھر بہ تدریج اسے استدلال اور تجزیے کی مدد سے آگے بڑھاتے ہیں۔ ناآحانہ اسلوب کے باوجود حالی کی تحریروں سے اکتاہٹ نہیں ہوتی جس کی اثر پذیری بھی قابل داد ہے۔

حالی کی نثر کو عام طور سے روکھی پھیکی تصور کیا جاتا ہے لیکن ان کے مضامین، بالخصوص زبان گویا جیسی تحریریں اس تاثر کی تردید

کرتی ہیں۔ زبان گویا محض ایک اخلاقی مضمون نہیں بلکہ ادبی سطح پر بھی ایک نمایاں اور منفرد مقام رکھتا ہے۔ یہ تمثیلی طرز کا مضمون ہے جس میں زبان کو ایک زندہ کردار کی صورت میں پیش کیا گیا ہے۔ اس میں حالی نے زبان کو خطاب کرتے ہوئے جس انداز بیان سے کام لیا ہے وہ اردو مضمون نگاری میں کم ہی دیکھنے کو ملتا ہے۔ گویا زبان ایک وجود ہے، ایک طاقت ہے، ایک کردار ہے، جس سے حالی محو گفتگو ہیں اور اس کی خوبیوں، خرابیوں، اثرات اور نتائج کو بے مثال چابکدستی سے نمایاں کر رہے ہیں۔

یہ مضمون اپنی فطرت میں محض اصلاحی نہیں بلکہ اس میں ادبی چاشنی اور تخیلاتی رنگ بھی شامل ہے۔ حالی نے زبان کے دونوں پہلوؤں اس کی شیرینی، نرمی، تاثیر اور ساتھ ہی اس کی تلخی، تندی اور ضرر رسانی کو نہایت توازن سے بیان کیا ہے۔ کہیں زبان کو ساحر کہا گیا ہے، کہیں افعی، کہیں شہد، کہیں حنظل، کہیں تریاق اور کہیں زہر۔ ان استعاراتی تشبیہوں سے مضمون میں شعری حسن اور فکری گہرائی پیدا ہو گئی ہے۔ زبان کے اس دورخی کردار کو حالی نے جس شدت سے محسوس کیا ہے، وہی شدت قاری بھی محسوس کرتا ہے۔ مضمون میں جہاں زبان کی طاقت کا بیان ہے وہیں اس کی ذمہ داریوں کا بھی پرزور ذکر ہے۔ زبان نہ صرف انسان کے جذبات کی ترجمان ہے بلکہ اس کی عزت، ذلت، نیک نامی، بدنامی، راحت اور تکلیف سب اسی کے زیر اثر ہے۔ حالی نے اس مضمون میں لکھا ہے کہ ایک ہاں اور ایک نہیں کتنے ہی لوگوں کی زندگی سنوار یا بگاڑ سکتی ہے۔ زبان ایک پارہ گوشت ہے مگر اس کی قوت اور اس کا اثر اس حد تک بڑھ سکتا ہے کہ بادشاہی چھن جائے دوستی دشمنی میں بدل جائے اور قوموں کی تقدیر رقم ہو جائے۔

'زبان گویا' میں حالی کا لہجہ ناصح کا ہے مگر واعظ کی سختی سے پاک وہ ایک مربی، ایک استاد، ایک باخبر دانشور کی طرح قاری کو متوجہ کرتے ہیں کہ زبان کی طاقت کو سمجھو، اس کا استعمال سوچ سمجھ کر کرو اور اس کی حفاظت کو اپنی اخلاقی ذمہ داری سمجھو۔ یہی وہ انداز ہے جو اس مضمون کو محض ایک اخلاقی نصیحت سے بلند کر کے ایک فکری تحریر اور ادبی شاہکار کا درجہ دیتا ہے۔ مضمون کی سب سے بڑی خوبی اس کی ہمہ گیری اور عصری معنویت ہے۔ یہ کوئی وقتی تحریر نہیں جو کسی مخصوص زمانے کے لیے ہو، بلکہ آج کے دور میں جب زبان کا غلط استعمال، بدزبانی، غیبت، تہمت اور افواہ جیسے مسائل عام ہو چکے ہیں، تو حالی کا یہ مضمون آج پہلے سے زیادہ اہم ہو گیا ہے۔ زبان کے صحیح استعمال کی تلقین اور اس کے اخلاقی پہلو کو جس باریکی اور لطافت سے حالی نے پیش کیا ہے، وہ آج بھی ہر قاری کے لیے سبق آموز ہے۔ مضمون کا مرکزی خیال ایک اخلاقی سبق ہے کہ انسان کو اپنی زبان پر قابو رکھنا چاہیے کیونکہ خیر و شر، عزت و ذلت، سب اسی سے وابستہ ہیں۔ یہ خیال نہ صرف منطقی ترتیب سے آگے بڑھتا ہے بلکہ جذباتی رنگ بھی رکھتا ہے، جو نثر کو خطابت کے درجے پر لے جاتا ہے۔ مضمون کے اختتام پر حالی کی دعا نہایت مؤثر اور دل سے نکلی ہوئی محسوس ہوتی ہے۔ یہ دعا صرف زبان کے لیے نہیں بلکہ انسان کے پورے اخلاقی وجود کے لیے ہے۔ وہ دعا کرتے ہیں کہ ہمیں سچی زبان، راست گفتاری اور دل و زبان کی یکسانی عطا ہو تاکہ ہم دنیا میں باعزت رہیں اور آخرت میں سرخرو ہوں۔ یہی دعا دراصل اس پورے مضمون کا نچوڑ بھی ہے اور حالی کی شخصیت کا عکاس بھی۔

زبان گویا کو اگر الطاف حسین حالی کے دیگر مضامین کے پس منظر میں دیکھا جائے تو یہ نہ صرف ان کی انشا پردازی کا ایک اعلیٰ نمونہ ہے بلکہ ان کی فکری بلوغت اور اخلاقی شعور کا بھی مظہر ہے۔ اس مضمون میں انشائیہ کا رنگ نمایاں ہے۔ جملے کہیں کہیں مقفیٰ ہیں جو عبارت میں حسن پیدا کرتے ہیں اور ہر لفظ ایک تراشے ہوئے جواہر کی طرح اپنی جگہ پر جگمگا رہا ہے۔ حالی کی یہ خوبی کہ وہ ایک سادہ سے موضوع کو بھی غیر معمولی بنا دیتے ہیں، اس مضمون میں پوری شان سے ظاہر ہوتی ہے۔ فنی اعتبار سے مضمون میں ربط و تسلسل برقرار ہے۔ آغاز سے انجام تک ایک فکری وحدت قائم ہے۔ البتہ بعض مقامات پر جذباتی شدت کے باعث جملے طویل ہو گئے ہیں۔ یہ مضمون اردو مضمون نگاری کی روشن روایت کا غماز ہے۔ اس میں فکر کی گہرائی، زبان کا جلال و جمال، اسلوب کی روانی اور اخلاقی پیغام کی شدت سب کچھ موجود ہے۔ اگرچہ اس میں وعظ کا رنگ غالب ہے، مگر اس کی ادبی دلکشی اور خطیبانہ حسن اسے ایک کلاسیکی شاہکار کے مرتبے پر فائز کرتا ہے۔

خود اکتسابی کے لیے سوالات I

خالی جگہیں پر کیجیے۔

1۔ الطاف حسین حالی کا انتقال ۔۔۔۔۔۔میں ہوا۔

2۔ حالی کی مشہور تصنیف ۔۔۔۔۔۔۔۔ہے۔

3۔ حالی کو حکومت نے 1904 میں ۔۔۔۔۔۔کا خطاب دیا۔

4۔ حالی مشہور سوانحی تصنیف میں یادگار غالب، ۔۔۔۔۔اور ۔۔۔۔۔شامل ہیں۔

5۔ حالی نے زبان کو کبھی ساحر، کبھی افعی اور کبھی ۔۔۔۔۔۔۔سے تشبیہ دی ہے۔

6۔ اردو میں باقاعدہ مضمون نگاری کا آغاز ۔۔۔۔۔۔تحریک کے زیر اثر ہوا۔

7۔ تہذیب الاخلاق رسالہ ۔۔۔۔۔۔۔نے جاری کیا تھا۔

8۔ حالی کے نزدیک زبان ۔۔۔۔۔۔کی امین اور ۔۔۔۔۔۔کی ایلچی ہے۔

9۔ حالی نے اپنی تحریروں میں ۔۔۔۔۔۔۔پر زور دیا ہے۔

10۔ حالی نے زبان کے استعمال میں ۔۔۔۔۔اور ۔۔۔۔۔کی تلقین کی ہے۔

11۔ حالی نے زبان کو ۔۔۔۔۔۔۔، ۔۔۔۔۔۔۔۔، ۔۔۔۔۔۔۔، ۔۔۔۔۔اور ۔۔۔۔۔کے طور پر مخاطب کیا ہے۔

12۔ حالی کے مقالات ۔۔۔۔۔۔جلدوں پر مشتمل ہیں۔

13۔ کہیں تیرا خطاب ۔۔۔۔۔۔ہے اور کہیں تیرا لقب ۔۔۔۔۔۔۔ہے۔

14۔ حالی نے مسدس مدوجزر اسلام ۔۔۔۔۔۔کی ترغیب پر لکھی تھی۔

15۔ مضمون زبان گویا کا مرکزی خیال یہ ہے کہ انسان کو اپنی ۔۔۔۔۔۔پر قابو رکھنا چاہیے۔

1.2.3 زبان گویا کے حوالے سے سننے (Listening) کی اہمیت

زبان انسان کے احساس وادراک، فکر وتخیل اور تہذیب وتمدن کی آئینہ ہے۔ یہ محض ابلاغ کا وسیلہ نہیں بلکہ انسان کے شعور کی جیتی جاگتی صورت ہے۔ کسی بھی زبان کو سیکھنے اور اس پر عبور حاصل کرنے کے لیے اس کی بنیادی چار مہارتوں، یعنی سننا، بولنا، پڑھنا اور لکھنا میں مہارت حاصل کرنا ضروری ہوتا ہے۔ یہ مہارتیں زبان کی بنیاد اور اس کے نظام اظہار کی تکمیل کرتی ہیں۔ ان میں سب سے پہلی اور فطری مہارت سننا ہے، جو انسان میں پیدائشی طور پر موجود ہوتی ہے۔ بچہ جب دنیا میں آتا ہے تو سب سے پہلے اپنے اطراف کی آوازوں سے آشنا ہوتا ہے۔ ماں کی بولی، گھر کے افراد کے لہجے اور اردگرد کے ماحول کی اصوات اس کے ذہن پر نقش چھوڑتی ہیں۔ وہ بولنے سے پہلے سنتا ہے اور یہی سننا رفتہ رفتہ اس کی زبان بننے لگتا ہے۔

سننا دراصل انسان کے شعور کی پہلی سیڑھی ہے۔ یہ محض سماعت نہیں بلکہ ایک شعوری عمل ہے جس میں انسان آوازوں کے درمیان فرق کرتا ہے۔ ان کے معنی تلاش کرتا ہے۔ ان پر غور کرتا ہے اور ان سے سیکھتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ماہرین لسانیات کے نزدیک سننے کو زبان سیکھنے کی اساس قرار دیا گیا ہے۔ اگر سننے کا عمل درست اور فعال نہ ہو تو بولنے، پڑھنے اور لکھنے جیسی دیگر مہارتیں بھی صحیح طور پر نشوونما نہیں پا سکتیں۔ سننے سے نہ صرف آوازوں کا علم حاصل ہوتا ہے بلکہ ان کے پس منظر میں پوشیدہ جذبات، معانی اور مفاہیم کا فہم بھی پیدا ہوتا ہے۔ زبان سیکھنے کے عمل میں سننے کی اہمیت اس لیے بھی زیادہ ہے کہ انسان زبان کو سب سے پہلے کانوں سے سیکھتا ہے۔ زبان کی آوازوں سے مانوس ہوتا ہے اور انہی آوازوں کے سہارے معنی کے دروازے کھلتے ہیں۔ سننے کی عمدہ صلاحیت رکھنے والا شخص نہ صرف بہتر بولتا ہے بلکہ اس کی تحریر میں بھی روانی، نرمی اور اثر پذیری پیدا ہو جاتی ہے۔ زبان کی دوسری مہارتیں دراصل سننے کی ہی توسیع ہیں۔ اچھا سننے والا بہتر قاری، سنجیدہ متکلم اور باریک بیں لکھنے والا بنتا ہے۔ تعلیم وتدریس میں سننے کی مہارت کی تربیت نہایت ضروری ہے۔ اگر

معلم طلبہ کو محض بولنے، پڑھنے یا لکھنے پر زور دے اور سننے کو نظر انداز کرے تو زبان کا سیکھنے والا اپنے فہم میں ادھورا رہ جائے گا۔ سننا ایک ایسی مہارت ہے جو انسان کو گفتگو کی تہہ تک پہنچنے کا حوصلہ دیتی ہے۔ اسے صبر، برداشت اور تفہیم کا شعور عطا کرتی ہے۔ جو شخص سننے کا ہنر جانتا ہے وہ دراصل سمجھنے اور محسوس کرنے کا ہنر بھی جانتا ہے۔

زبان کی چاروں مہارتوں کی اہمیت زبان سیکھنے کے عمل میں اس وقت مزید نمایاں ہو جاتی ہے جب ہم یہ جانتے ہیں کہ ہر مہارت دوسری مہارت کا دروازہ کھولتی ہے۔ سننا بولنے کو جنم دیتا ہے، بولنا پڑھنے کی رغبت پیدا کرتا ہے اور پڑھنا لکھنے کی صلاحیت کو نکھارتا ہے۔ یوں زبان کے یہ چاروں ستون ایک عمارت کی مانند ہیں، جن میں سے ایک بھی کمزور ہو تو پوری عمارت کا توازن بگڑ جاتا ہے۔ چنانچہ سننے کی تربیت کو محض ایک فطری عمل سمجھ کر نظر انداز نہیں کرنا چاہیے بلکہ اسے زبان سیکھنے کے شعوری اور لازمی مرحلے کے طور پر اپنانا چاہیے۔

حالی کے مضمون ''زبان گویا'' کو اگر طلبہ غور سے سنیں تو انہیں محض زبان کی لذت بیان ہی نہیں بلکہ اخلاق، احساس اور شعور کی تربیت بھی حاصل ہوتی ہے۔ اس مضمون کا مطالعہ سننے کے ذریعے کرنے سے طلبہ کو زبان کے صوتی حسن، الفاظ کی نرمی و تیزی اور لہجے کے نشیب و فراز کو سمجھنے کی صلاحیت پیدا ہوتی ہے۔ حالی کی تحریر میں صوتی آہنگ اس قدر دلکش ہے کہ سننے والا زبان کے زیر و بم کے ساتھ ساتھ جذبات کی شدت کو بھی محسوس کرتا ہے۔ جب طلبہ اس مضمون کو سنتے ہیں تو وہ صرف معنی نہیں سیکھتے بلکہ الفاظ کی موسیقیت آمیز ربط، تلفظ کی درستی اور جملوں کی معنوی ترتیب کو بھی سمجھنے لگتے ہیں۔ اس طرح سننے کا عمل انہیں زبان کی تہذیبی روح سے جوڑ دیتا ہے اور ان کے اندر احساس زبان بیدار ہوتا ہے۔ اس مضمون کے سننے سے طلبہ میں سننے کی مہارت کے کئی پہلو نکھرتے ہیں۔ وہ الفاظ اور آوازوں میں فرق کرنا سیکھتے ہیں، بولنے والے کے جذبات کو اس کے لہجے سے محسوس کرنے لگتے ہیں اور زبان کے صحیح تلفظ اور درست ادائیگی پر ان کی توجہ مرکوز ہوتی ہے۔ حالی کے جملوں میں جو نرمی، طنز، محبت اور اصلاحی سوز موجود ہے وہ صرف پڑھنے سے نہیں بلکہ سننے سے زیادہ مؤثر انداز میں دل پر اثر کرتا ہے۔ سننے والا سمجھتا ہے کہ زبان محض بولنے کا آلہ نہیں بلکہ ایک طاقت ہے جو دلوں کو جوڑ بھی سکتی ہے اور توڑ بھی۔ یہی شعور سننے کے ذریعے پیدا ہوتا ہے کہ زبان کے استعمال میں سچائی، احتیاط اور نرمی کتنی ضروری ہے۔

طلبہ جب ''زبان گویا'' کو توجہ سے سنتے ہیں تو ان کے اندر زبان کے اخلاقی پہلو کی سمجھ بڑھتی ہے۔ وہ یہ جاننے لگتے ہیں کہ زبان کی طاقت کو مثبت اور بامقصد طور پر استعمال کرنا کس قدر اہم ہے۔ اس مضمون کے سننے سے ان میں اچھا سامع بننے کی صلاحیت پیدا ہوتی ہے، وہ سن کر سوچنے اور سمجھ کر بولنے کی صلاحیت بھی حاصل کرتے ہیں۔ اس طرح سننا صرف ایک صوتی عمل نہیں رہتا بلکہ فکری و اخلاقی تربیت کا ذریعہ بن جاتا ہے۔ حالی کی زبان سننے سے ذہن میں الفاظ کا حسن، معنی کی گہرائی اور بیان کی تاثیر زندہ رہتی ہے۔ یہ سماعت طلبہ کو زبان کی فطری نرمی، الفاظ کے انتخاب اور گفتار کی تہذیب سے روشناس کراتی ہے۔ ادبی سطح پر بھی اس مضمون کے سننے سے سامع کے اندر لسانی ذوق پیدا ہوتا ہے۔ وہ آوازوں کے اتار چڑھاؤ سے مفہوم کے بدلنے کا احساس کرتا ہے اور اندازہ لگاتا ہے کہ کہاں زبان دل کو چھوتی ہے اور کہاں چبھتی ہے۔ اس عمل سے طلبہ میں نہ صرف سننے بلکہ بولنے اور لکھنے کی صلاحیت بھی بہتر ہوتی ہے کیونکہ وہ زبان کے صوتی حسن اور فکری تاثر دونوں کو محسوس کرتے ہیں۔ حالی نے زبان کو جس طرح ایک زندہ، حساس اور طاقتور مخلوق کے طور پر پیش کیا ہے وہ صرف اس وقت پوری طرح محسوس کیا جا سکتا ہے جب اسے توجہ سے سنا جائے۔ یوں ''زبان گویا'' کا سننا طلبہ کے لیے زبان سیکھنے، سمجھنے اور برتنے کا بہترین تجربہ بن جاتا ہے۔ یہ طلبہ کو ادب سے دلچسپی، زبان کے حسن ادا سے واقف، سماعت میں نرمی اور دھیان پیدا کرتا ہے اور سب سے بڑھ کر انہیں سچ بولنے، نرم لہجے میں بات کرنے اور الفاظ کے وقار کو قائم رکھنے کا درس دیتا ہے۔

1.2.4 قواعد: اسم اور ضمیر کی تعریف مع اقسام

عزیز طلبہ اب ہم اردو قواعد میں اسم اور ضمیر کے بارے میں تفصیل سے جاننے والے ہیں۔ اسم اور ضمیر سیکھنے سے نہ صرف آپ جملوں کی صحیح ساخت اور معنی کو بھی بخوبی سمجھ سکیں گے بلکہ اردو بولنے اور لکھنے کی مہارت بھی بہتر ہوگی۔ اس کے علاوہ آپ کسی کو مخاطب

کرنے یا کسی چیز کو بیان کرنے میں درست الفاظ کا انتخاب کر پائیں گے جس سے آپ کی بات چیت زیادہ واضح اور مؤثر ہوگی۔ ادبی متون کا مطالعہ کرتے وقت بھی اسم اور ضمیر کے فرق کو سمجھنا آپ کو الفاظ کی باریکی اور جملوں کے حسن کو پہچاننے میں مدد دے گا۔ یہاں آپ سیکھیں گے کہ اسم اور ضمیر کیا ہوتے ہیں۔ ان کی اقسام کیا ہیں اور انہیں جملوں میں صحیح طریقے سے کیسے استعمال کیا جاتا ہے۔

اسم کی تعریف: اسم (Noun) وہ کلمہ یا لفظ ہے جس سے کسی شخص، چیز، جگہ یا مخلوق کا نام معلوم ہو۔

مثالیں:

شخص: راشد، فاطمہ

چیز: قلم، کتاب

جگہ: حیدرآباد، ممبئی

پھل یا جانور: سیب، گھوڑا

اسم کی اقسام:

اسم کی دو قسمیں ہیں معرفہ اور نکرہ۔ معرفہ اور نکرہ کی بھی متعدد قسمیں ہیں۔ یہاں انہیں اقسام پر تفصیل سے روشنی ڈالی گئی ہے۔

۱۔ اسم معرفہ کی تعریف:

اسم معرفہ (Proper Noun) وہ ہوتا ہے جو کسی خاص یا معین (معلوم) شخص، جگہ، چیز یا مخلوق پر دلالت کرے اسے اسم خاص بھی کہتے ہیں۔ یعنی جب ہم کسی چیز کا ذکر خاص طور پر کریں اور سننے والے کو معلوم ہو کہ بات کس کے بارے میں ہو رہی ہے، تو وہ اسم معرفہ کہلاتا ہے۔ جیسے

حامد: ایک خاص شخص کا نام

قرآن: ایک خاص کتاب کا نام

ہندوستان: ایک مخصوص ملک کا نام

جامعہ ملیہ اسلامیہ: ایک مخصوص ادارہ

اقسام اسم معرفہ اور مثالیں:

خطاب: بادشاہ، امرا، حکومت اور عوام کی طرف سے ان کی خدمات کے عوض جو اعزازی نام دیا جاتا ہے اسے خطاب کہتے ہیں۔ جیسے شمس العلما، خان بہادر، خاقانی ہند وغیرہ

لقب: وہ خاص نام جو کسی خاص خوبی یا بڑائی کی وجہ سے مشہور ہو جائے۔ جیسے کلیم اللہ، شیر خدا، رستم ہند، بلبل ہند، ملکہ ترنم وغیرہ

کنیت: وہ نام جو کسی کے ماں باپ یا کسی اور رشتے کی نسبت سے بولا جائے جیسے ابن مریم، ابن کلثوم، ام سلمی، ابوطالب وغیرہ

عرف: وہ نام جو اصل نام کی جگہ محبت، حقارت یا پھر رنگت وغیرہ کی وجہ سے پڑ جائے۔ جیسے کلو، گڑیا، لمبو، ننھے میاں اور چنو وغیرہ۔

تخلص: وہ مختصر نام جو شاعر اپنے اصل نام کی جگہ شاعری میں استعمال کرتا ہے۔ غالب، حالی، آزاد، اقبال، جوش اور فراق اغیرہ

۲۔ اسم نکرہ کی تعریف: اسم نکرہ (Common Noun) وہ اسم (نام) ہوتا ہے جو کسی غیر مخصوص (نامعلوم یا عام) شخص، جگہ، چیز یا مخلوق پر دلالت کرے۔

یعنی جب ہم کسی چیز کا عام طور پر ذکر کریں، بغیر یہ بتائے کہ وہ کون سی خاص چیز ہے، تو وہ اسم نکرہ کہلاتا ہے۔ اسم نکرہ کو اسم عام بھی کہا جاتا ہے۔

مثالیں:

لڑکا: کوئی بھی لڑکا

کتاب: کوئی بھی کتاب
شہر: کوئی بھی شہر
پھول: کوئی بھی پھول
درخت: کوئی بھی درخت

اسم نکرہ کی اقسام:

اسم کیفیت: وہ اسم ہے جس سے کوئی خاص حالت،صفت یا کیفیت کا علم ہو۔جیسے خوشی،سچائی،نیکی،غم، روشنی،سختی،صحت وغیرہ۔اسے جملوں کے ذریعے اس طرح سمجھا جاسکتا ہے کہ بچوں کے چہرے پر خوشی چھائی ہوئی تھی۔ماں کی محبت بے مثال ہوتی ہے۔ایمان داری سب سے بڑی خوبی ہے۔ان جملوں میں خوشی،محبت اور ایمانداری کو دیکھا جاسکتا ہے۔

اسم ظرف: کسی جگہ یا وقت کے بارے میں بتانے والا اسم۔یعنی جس لفظ سے یہ معلوم ہو کہ کام کب اور کہاں ہوا اس اسے اسم ظرف کہتے ہیں۔جیسے: میں کل گھر گیا تھا۔اس میں کل وقت اور گھر جگہ کو بتاتا ہے۔اسی طرح کتاب الماری میں رکھی ہے میں کتاب اور الماری۔

اسم آلہ: وہ اسم جس سے معلوم ہو کہ کوئی کام کس چیز کے ذریعے کیا گیا،جیسے:قلم، چابی،چھری وغیرہ۔میں نے قلم سے لکھا میں قلم اسم آلہ ہے۔

اسم جمع: ایسے اسم کو کہتے ہیں جو بظاہر واحد معلوم ہوتے ہیں لیکن حقیقت میں وہ متعدد اسموں کا مجموعہ ہوتے ہیں۔جیسے فوج،انجمن،قوم،جماعت،لشکر وغیرہ

ضمیر کی تعریف اور اقسام:

ضمیر(Pronoun) وہ کلمہ جو اسم خاص کے بدلے بولا جائے ضمیر یا اسم ضمیر کہلاتا ہے۔جیسے میں،وہ،ہم،تم،تم کو،تیرا،تمہارا،اسکا،میرا،ہمارا،مجھے وغیرہ۔مثلا: حامد اسکول گیا وہ ایک محنتی طالب علم ہے اس کا گھر اسکول سے قریب ہے۔اس جملے میں وہ اور اسکا حامد کی جگہ استعمال ہوا ہے اس لیے وہ اور اسکا ضمیر ہیں۔

ضمیر کا مقصد یہ ہے کہ جملہ مختصر،رواں اور خوبصورت بن جائے۔اگر ان تینوں جگہوں پر حامد کا نام لیا جاتا تو عبارت بھدی اور بری معلوم ہوتی اور سننے والے کو ناگوار بھی لگتا۔کسی چیز کو بار بار استعمال نہ کر کے اس کی جگہ ضمیر کا استعمال کیا جاتا ہے۔یاد رہے کہ اردو ضمائر میں تذکیر وتانیث کا امتیاز نہیں ہوتا ہے جب تک کہ ان کا استعمال فعل کے ساتھ نہ ہو۔ضمیر کا مطالعہ طلبہ کو جملے میں اسم کی تکرار سے بچنے اور زبان کو رواں اور خوبصورت بنانے میں مدد دیتا ہے۔ضمیر کے ذریعے ہم کسی شخص یا چیز کا نام بار بار دہرانے کے بجائے اس کی طرف اشارہ یا حوالہ دیتے ہیں جس سے جملہ مختصر اور مؤثر بن جاتا ہے۔اب ہم چند جملوں کی مدد سے ضمیر کو سمجھنے کی کوشش کریں گے تاکہ آپ ضمیر کی پہچان کرسکیں اور جملوں میں استعمال ہونے والی ضمائر کو صحیح طور پر سمجھ سکیں۔راشد گھر گیا وہ بہت خوش ہے۔یہاں وہ کا استعمال راشد کی جگہ پر ہوا اس لیے وہ ضمیر ہے۔طالب علم کمرے میں ہیں وہ سبق یاد کر رہے ہیں۔وہ ضمیر ہے جو طالب علم کی جگہ آئی ہے۔

ضمیر کی اقسام:

ضمیر شخصی: وہ ہے جو کسی اشخاص کے لیے استعمال کی جاتی ہے۔اس کی تین صورتیں ہوسکتی ہیں یعنی ایک وہ جو بات کرتا ہے اسے متکلم کہتے ہیں۔دوسرا وہ جس سے بات کی جاتی ہے اسے مخاطب اور جس کی نسبت گفتگو ہو رہی ہے اسے غائب کہا جاتا ہے۔جیسے میں (متکلم) نے تمہیں (مخاطب) بتایا کہ وہ (غائب) اسکول جا رہا ہے۔

ضمیر موصولہ: ضمیر موصولہ وہ ضمیر ہے جو دو جملوں کو آپس میں ملائے اور پہلے اسم کی طرف اشارہ کرے۔جیسے وہ لڑکا جو کل آیا تھا میرا بھائی ہے۔وہ کتاب جو تم نے دی تھی بہت اچھی ہے۔وہ جگہ جہاں ہم کل گئے تھے بہت صاف تھی۔وہ گھر جس کے سامنے درخت ہے میرا ہے۔ان جملوں میں جو،جس،جنہوں نے وغیرہ الفاظ ہیں۔جو پہلے اسم کو بعد والے جملے سے جوڑ رہے ہیں وہی ضمائر موصولہ ہیں۔

ضمیر استفہامیہ: وہ ضمیر ہے جس کے ذریعے کسی چیز یا شخص کے بارے میں سوال کیا جائے۔ یہ ضمائر ہمیشہ سوالیہ جملوں میں آتے ہیں۔ جیسے کون، کیا، کس، کس کا، کس نے، کس کو وغیرہ۔ مثلاً کون آیا۔ کس نے دروازہ کھٹکھٹایا۔ یہ کتاب کس کی ہے۔

ضمیر تنکیر: وہ ضمیر ہے جو غیر یقینی، غیر معین شخص یا چیز کے لیے استعمال ہو۔ یہ دو ہیں کوئی اور کچھ۔ ان کا جملوں میں استعمال اس طرح ہوتا ہے کون ہے یہاں؟ کوئی نہیں۔ آپ کیا کھائیں گے؟ کچھ بھی دیجیے۔

ضمیر اشارہ: وہ ضمیر ہے جس سے کسی چیز یا شخص کی طرف اشارہ کیا جائے۔ یہ، وہ، یہی، وہی، انہی، انہی کو، اسی وغیرہ۔ جیسے یہ خریدو گے یا وہ۔ اس جملہ میں یہ اور وہ اشارہ کے لیے ہیں۔ واضح رہے کہ یہ قریب جبکہ وہ دور کی چیز کی طرف اشارہ کرنے کے لیے استعمال ہوتا ہے۔

عزیز طلبہ: آپ اسم، ضمیر اور ان کی اقسام کے بارے میں پڑھ چکے ہیں۔ اب الطاف حسین حالی کے مضمون زبان گویا کے مذکورہ متن سے چند منتخب مثالیں درج کی جارہی ہیں۔ ان مثالوں کے ساتھ اصل جملے بھی دیے گئے ہیں تاکہ آپ یہ دیکھ سکیں کہ قواعد عملی طور پر متن میں کس طرح برتے گئے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ یہ متن قواعد اردو کو سمجھنے کے لیے بھی نہایت اہم ہے۔

اسم کی مثالیں: زبان، بلبل، داستان، درخت، ٹہنی، چمن، پودا، پھول، رنگ، پھل، مزہ، بچپن، بول، جوانی، نرمی، دل، عزت، ذلت، نیک نامی، بدنامی، طاقت، نمونہ، قدرت، دنیا، عیب، منصب وغیرہ۔

اسم معرفہ کی مثالیں: الطاف حسین حالی، زبانِ گویا، الٰہی، سبحان اللہ وغیرہ۔

اسم نکرہ کی مثالیں: درخت، چمن، پودا، پھول، پھل، دشمن، دوست، جانور، آدمی، دل، عیب

اسم کیفیت کی مثالیں: محبت، نرمی، عزت، ذلت، نیک نامی، بدنامی، طاقت، آرام، تکلیف، آزادی، راستی

اسم ظرف کی مثالیں: بچپن، جوانی، دنیا وغیرہ

اسم آلہ کی مثالیں: کنجی، قفل، زبان وغیرہ

اسم جمع کی مثالیں: بولوں، دلوں، عیب، تماشے، جانیں، سیکڑوں، ہزاروں، لاکھوں، کروڑوں وغیرہ

ضمیر کی مثالیں: تو، تیری، تیرا: راستی تیرا جوہر ہے اور آزادی تیرا زیور۔ مگر تیری طاقت نمونہ قدرت الٰہی ہے۔

ہم، ہماری، ہمارا: ہماری عزت، ہماری ذلت، ہماری نیک نامی، ہماری بدنامی... ہمارا سچ، ہمارا جھوٹ...

انہوں نے: اے زبان! جنہوں نے تیرا کہنا مانا... انہوں نے سخت الزام اٹھائے۔

ضمیر موصولہ کی مثالیں:

جو: جنہوں نے: اے زبان! جنہوں نے تیرا کہنا مانا اور جو تیرا حکم بجالائے...

ضمیر استفہامیہ کی مثالیں:

کس: سچ بتا، تو کس درخت کی ٹہنی اور کس چمن کا پودا ہے؟

کہاں: نہیں معلوم تو نے کہاں سیکھا؟

ضمیر اشارہ کی مثالیں:

یہ: یہ منصبِ عالی تجھ سے چھن جائے گا۔

زبان گویا طلبہ کے لیے اسم، ضمیر اور ان کی اقسام کو سمجھنے میں بہت مددگار رہے کیونکہ اس میں مختلف جملوں میں اسم اور ضمیر کا عملی استعمال دکھایا گیا ہے۔ یہاں طلبہ اسم معرفہ، اسم نکرہ، اسم کیفیت، اسم ظرف، اسم آلہ اور اسم جمع کے ساتھ ضمیر، ضمیر موصولہ، ضمیر استفہامیہ، ضمیر اشارہ کے استعمال کو واضح طور پر دیکھ سکتے ہیں۔ اس سے طلبہ صرف قواعد یاد نہیں کرتے بلکہ یہ سمجھ پاتے ہیں کہ زبان میں اسم اور ضمیر کس طرح جملوں میں برتے جاتے ہیں اور زبان کی روانی اور معنی میں کس طرح مدد کرتے ہیں۔

خود اکتسابی کے لیے سوالات II

صحیح یا غلط کی نشان دہی کیجیے۔

1۔ سننے کی مہارت زبان سیکھنے کی چار بنیادی مہارتوں میں سب سے پہلی ہے۔ صحیح/غلط

2۔ سننا صرف کانوں کا عمل ہے، اس کا ذہن سے کوئی تعلق نہیں۔ صحیح/غلط

3۔ مؤثر سننے سے بولنے اور سمجھنے کی صلاحیت بہتر ہوتی ہے۔ صحیح/غلط

4۔ حالؔی کے مضمون ''زبان گویا'' میں زبان کی طاقت اور اثر پذیری کو بیان کیا گیا ہے صحیح/غلط

5۔ ''زبان گویا'' کے سننے سے طلبہ کو زبان کے صوتی حسن اور تلفظ کی درستی کا احساس ہوتا ہے صحیح/غلط

6۔ ''زبان گویا'' سننے سے طلبہ میں زبان کے تاثر، لہجے اور تلفظ کی پہچان پیدا ہوتی ہے۔ صحیح/غلط

7۔ ''لڑکا'' اسم معرفہ کی مثال ہے۔ صحیح/غلط

8۔ ''صبح'' اور ''گاؤں'' اسم ظرف کی مثالیں ہیں۔ صحیح/غلط

9۔ ''غزالی'' اور ''فاروق اعظم'' کنیت کی مثالیں ہیں۔ صحیح/غلط

10۔ ضمیر کا استعمال جملے کو غیر ضروری طور پر لمبا بنا دیتا ہے۔ صحیح/غلط

11۔ اردو ضمائر میں تذکیر و تانیث کا امتیاز نہیں پایا جاتا ہے۔ صحیح/غلط

12۔ مدرسہ اسم جمع کی مثال ہے۔ صحیح/غلط

13۔ ''میں''، ضمیر متکلم ہے۔ صحیح/غلط

14۔ سننے سے غلطیوں کے امکانات بہت کم ہوتے ہیں۔ صحیح/غلط

15۔ اسم معرفہ کو اسم عام بھی کہتے ہیں۔ صحیح/غلط

1.3 الفاظ اور معنی

الفاظ	معنی
افعی جاں گداز	زہرناک سانپ، جان لینے والا
امین	امانت دار
ارشاد	رہنمائی
افترا	من گھڑت الزام
ایلچی	یغام رساں
اعلیٰ	عمدہ، بلند
افکار	فکر کی جمع
فسوں ساز	جادوگر، فریب دینے والا
بساط	حیثیت، مقام
بلبلِ ہزار داستان	بہت سی کہانیاں سنانے والی بلبل
بہتان	جھوٹا الزام
پھبتی	طنزیہ یا مذاق کے جملے

پھکڑ	فحش یا بازاری مذاق
تلقین	نصیحت کرنا
تشنیع	طنز، ملامت
ترجمان	معنی ظاہر کرنے والا، بولنے والا
تریاق	زہر کا توڑ
ثابت قدم	پُرعزم، قائم رہنے والا
جسارت	ہمت، دلیری
جوہر	اصل خوبی، صفت
خیانت	ددیانتی
دشنام	گالی
راست گفتار	سچی زبان
ریاکار	دکھاوا کرنے والا
زبوں	ذلیل، حقیر
زیان	نقصان
ساحر فسوں ساز	جادوگر، فریب دینے والا
سخن ساز	باتیں بنانے والا، چرب زبان
شوخیاں	نٹ کھٹ حرکتیں
طوطی شیوا بیان	فصیح و بلیغ بولنے والی زبان
غماز	راز ظاہر کرنے والا
فائق	اعلیٰ، عمدہ
فریب	دھوکہ
فگار	زخمی، مجروح
قاصد	پیغام پہنچانے والا
کاشفِ اسرار	بھید کھولنے والا
محرمِ راز	رازدار
مطلق العنان	آزاد، بے روک
وحشت	گھبراہٹ، ڈر

1.4 خود اکتسابی سوالات کے جوابات

I

1۔ 1914

2۔ مقدمہ شعر و شاعری

3۔ شمس العلماء

4۔ حیات سعدی/ حیات جاوید

5۔ شہد و حنظل

6۔ علی گڑھ تحریک

7۔ سرسید احمد خاں

8۔ دل/ روح

9۔ اصلاح معاشرہ

10۔ احتیاط/ نرمی

11۔ بلبل ہزار داستان، طوطی شیوا بیاں، قاصد، ترجمان، وکیل

12۔ دو

13۔ کاشف اسرار/ محرر راز

14۔ سرسید احمد خاں

15۔ زبان

II

1۔ صحیح

2۔ غلط

3۔ صحیح

4۔ صحیح

5۔ صحیح

6۔ صحیح

7۔ غلط

8۔ صحیح

9۔ غلط

10۔ غلط

11۔ صحیح

12۔ غلط

13۔ صحیح

14۔ صحیح

15۔ غلط

1.5 خلاصہ

مولانا الطاف حسین حالی (1837–1914) اردو ادب کی تاریخ میں ایک روشن باب کی حیثیت رکھتے ہیں۔ ان کا اصل نام الطاف حسین اور تخلص حالؔی تھا۔ وہ پانی پت میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم وہیں حاصل کی، پھر دہلی آئے جہاں انہیں اس وقت کے علمی و ادبی ماحول نے گہرے طور پر متاثر کیا۔ دہلی میں انہوں نے مرزا غالبؔ اور شیخ امام بخش ناسخ جیسے اساتذہ سے استفادہ کیا۔ حالؔی کا شمار ان ادیبوں میں ہوتا ہے جنہوں نے اردو ادب کو اصلاح، سادگی اور مقصدیت کی راہ دکھائی۔ 1857 کی جنگ آزادی کے بعد ہندوستان میں جو تہذیبی اور اخلاقی انحطاط پیدا ہوا، اس دور میں حالی نے قلم کے ذریعے قوم کی فکری و اخلاقی بیداری کی کوشش کی۔ انہوں نے ادب کو محض لطف و ذوق کا وسیلہ نہیں سمجھا بلکہ اسے اصلاح قوم کا ذریعہ بنایا۔ حالی کا تعلق سرسید احمد خاں کے مصلحانہ تحریک علی گڑھ سے بھی رہا اور وہ سرسید کے مخلص ترین رفقا میں شمار کیے جاتے ہیں۔ حالی کی خدمات بہت متنوع ہے۔ انہوں نے شاعری، نثر، تنقید، سوانح نگاری اور سماجی اصلاح جیسے موضوعات پر قلم اٹھایا۔ ان کی اہم تصانیف میں مقدمہ شعر و شاعری، یادگار غالب، حیات سعدی، حیات جاوید اور مسدس مدوجزر اسلام کو غیر معمولی مقبولیت حاصل ہے۔ انہوں نے بڑی تعداد میں مضامین و مقالات بھی تحریر کیے۔ ان کے مقالات دو جلدوں میں شائع ہو چکے ہیں۔ حالی نے نثر میں بھی سادگی، روانی اور فکر کی گہرائی پیدا کی۔ ان کے مضامین میں مقصدیت، اخلاقی سنجیدگی اور عملی حکمت نمایاں ہے۔ زبان گویا انہی خصوصیات کی نمائندہ تحریر ہے، جس میں زبان کو انسانی تہذیب اور شعور کا بنیادی وسیلہ قرار دیا گیا ہے۔

حالی کا کارنامہ محض ادبی تخلیق تک محدود نہیں بلکہ وہ اردو کے پہلے ایسے ادیب ہیں جنہوں نے ادب کو زندگی کے مسائل سے جوڑ دیا۔ ان کی تحریروں میں اخلاق، اصلاح، علم اور انسان دوستی کا امتزاج پایا جاتا ہے۔ حالی کی یہی خصوصیات انہیں اردو ادب کی تاریخ میں ایک مصلح، مفکر، نقاد اور انسان دوست ادیب کی حیثیت عطا کرتی ہیں۔ ان کا مشہور مضمون 'زبان گویا' اردو نثر کا ایک عمدہ نمونہ ہے، جس میں زبان کی فطری قوت، تاثیر اور تہذیبی کردار کو نہایت دلکش انداز میں بیان کیا گیا ہے۔ حالی زبان کو محض بولنے کا آلہ نہیں بلکہ ایک زندہ اور حساس قوت قرار دیتے ہیں جو انسان کے باطن کا ترجمان ہے۔ وہ سمجھاتے ہیں کہ زبان دل کی ترجمان ہوتی ہے، اگر یہ دل سے نکلے تو دل تک پہنچتی ہے اور اگر اس میں بناوٹ، جھوٹ یا درشتی ہو تو اثر زائل ہو جاتا ہے۔ زبان انسان کی تہذیب، اس کے اخلاق اور اس کی شخصیت کا مظہر ہے۔ مہذب زبان مہذب معاشرے کو جنم دیتی ہے اور بدزبان معاشرہ ہمیشہ زوال کی راہ پر چلتا ہے۔

فنی اعتبار سے زبان گویا اردو نثر کی ایک اعلیٰ مثال ہے۔ حالی کا اسلوب سادہ مگر پراثر ہے۔ ان کے جملوں میں نرمی، فصاحت اور فطری توازن پایا جاتا ہے۔ وہ مشکل تراکیب اور مبالغہ آرائی سے گریز کرتے ہیں، لیکن ان کے ہر فقرے میں ایک نیا خیال اور اخلاقی پیغام پوشیدہ ہوتا ہے۔ ان کی زبان نہ صرف سمجھ میں آنے والی ہے بلکہ دل میں اتر جانے والی بھی ہے۔ مضمون کی ساخت مربوط ہے اور ہر نیا خیال پچھلے سے جڑا ہوا محسوس ہوتا ہے۔ یہی سادہ اور بامعنی نثر حالی کو جدید نثر کے بنیاد گزاروں میں شمار کراتی ہے۔ زبان گویا کے مطالعے سے زبان کی تدریسی اہمیت بھی اجاگر ہوتی ہے۔ زبان سیکھنے کی چار مہارتوں سننا، بولنا، پڑھنا اور لکھنا میں زبان گویا خاص طور پر سننے کی مہارت سے گہرا تعلق رکھتے ہیں۔ سننا زبان سیکھنے کی بنیاد ہے۔ جب طلبہ کسی اچھے مضمون یا خوبصورت نثر کو توجہ سے سنتے ہیں تو وہ محض الفاظ نہیں بلکہ ان میں چھپے جذبات، آہنگ اور معنوی نزاکتوں کو بھی سمجھتے ہیں۔ زبان گویا کو اگر غور سے سنا جائے تو احساس ہوتا ہے کہ حالی کے الفاظ میں ایک مخصوص نرمی، تہذیب اور اثر پوشیدہ ہے جو محض پڑھنے سے حاصل نہیں ہوتا۔

سننا صرف آواز سن لینا نہیں بلکہ سمجھنا اور محسوس کرنا بھی ہے۔ سننے کے ذریعے زبان کے تلفظ، روانی اور اندازِ بیان کا شعور پیدا ہوتا ہے۔ جب طلبہ استاد کے لہجے میں حالی کے جملے سنتے ہیں یا خود پڑھتے ہیں تو انہیں زبان کی مٹھاس، صوتی حسن اور بیان کی شائستگی کا عملی تجربہ حاصل ہوتا ہے۔ یہی سننے کی تربیت بولنے اور لکھنے کی بنیاد رکھتی ہے۔ اس طرح سننے کی مہارت زبان گویا کے ذریعے زبان کی فہم، ذوق اور تہذیبی شعور کو پروان چڑھاتی ہے۔ اکائی میں، اسم اور ضمیر جیسے بنیادی قواعد کی وضاحت بھی کی گئی ہے، تاکہ طلبہ زبان کی ساخت کو سمجھ

سکیں۔اسم وہ لفظ ہے جو کسی شخص، چیز یا جگہ کا نام ظاہر کرے، جیسے: انسان، کتاب، دہلی۔ضمیر وہ لفظ ہے جو اسم کی جگہ استعمال ہوتا ہے، جیسے: وہ، میں، ہم۔ان دونوں اجزاء سے جملے کی ساخت مکمل ہوتی ہے اور زبان کا نظم قائم رہتا ہے۔

اکائی کے آخر میں خود اکتسابی سوالات و جوابات شامل کیے گئے ہیں تا کہ طلبہ اپنی سمجھ کو جانچ سکیں۔مشکل الفاظ کے معنی درج کر کے لغوی استعداد کو بڑھایا گیا ہے، تا کہ طلبہ متن کو بہتر طور پر سمجھ سکیں۔مجموعی طور پر زبان گویا زبان کے محض لسانی پہلو نہیں بلکہ اس کے اخلاقی اور تہذیبی پہلو کو بھی نمایاں کرتی ہے۔حالی کا پیغام یہ ہے کہ زبان انسان کے شعور، اخلاق اور کردار کا آئینہ ہے۔اگر زبان سچی، شائستہ اور نرم ہے تو انسان مہذب ہے اور اگر زبان میں جھوٹ اور سختی ہے تو دل کی سختی بھی بڑھ جاتی ہے۔زبان کو درست طور پر بولنا، سننا اور سمجھنا انسان کی پہچان ہے۔زبان گویا ہمیں یہی سکھاتی ہے کہ زبان محض الفاظ کا مجموعہ نہیں بلکہ انسانیت، تہذیب اور احساس کی ترجمان ہے۔

1.6 خود اکتسابی کے لیے مشق

تحریری سرگرمیاں:

نیچے دیے گئے اقتباس میں اسم، ضمیر، صفت، فعل فاعل، مفعول، محاورے اور روزمرہ کی شناخت کریں۔

اے زبان! تیرا منصب بہت عالی ہے اور تیری خدمت نہایت ممتاز، کہیں تیرا خطاب کاشف اسرار ہے اور کہیں تیرا لقب محرم راز۔علم کہ ایک خزانہ غیبی ہے اور دل اس کا خزانچی۔حوصلہ اس کا قفل ہے اور تو اس کی کنجی۔دیکھ اس قفل کو بے اجازت نہ کھول اور اس خزانے کو بے موقع نہ اٹھا۔وعظ و نصیحت تیرا فرض ہے اور تلقین و ارشاد تیرا کام۔ناصح مشفق تیری صفت ہے اور مرشد برحق تیرا نام۔خبردار! اس نام کو عیب نہ لگانا اور اس فرض سے جی نہ چرانا، ورنہ یہ منصب عالی تجھ سے چھن جائیگا اور تیری بساط میں وہی ایک گوشت کا چھیچھڑا رہ جائیگا۔

کیا تجھ کو یہ امید ہے کہ تو جھوٹ بھی بولے اور طوفان بھی اٹھائے، تو غیبت بھی کرے اور تہمت بھی لگائے، تو فریب بھی کرے اور چغلیاں بھی کھائے اور پھر وہی زبان کی زبان کہلائے۔نہیں! ہرگز نہیں!! اگر تو سچی زبان ہے تو زبان ہے ورنہ زبوں ہے بلکہ سراسر زیاں ہے۔اگر تیرا قول صادق ہے تو شہد فائق ہے ورنہ تھوک دینے کے لائق ہے۔اگر تو راست گفتار ہے تو ہمارے منہ میں اور دوسروں کے دلوں میں جگہ پائیگی ورنہ گدی سے کھینچ کر نکالی جائیگی۔

کام کا تجربہ:

دیے گئے جملوں کا اردو میں ترجمہ کریں۔

The sun is shining

My father reads the newspaper daily

When I reached home, it was very late

We must take care of our environment

I don't understand this question

I can speak Urdu and English

We visited the zoo last Sunday

The sun rises in the east

He is stronger than me

I am glad to meet you

I don't know what you are saying

I have been studying for two hours

Please be on time

Time and tide wait for none

Do you like reading stories

How did you solve this problem

She was upset about the result

Don't lose hope

1.7 مشقی سوالات

1۔ الطاف حسین کی شخصیت اور سوانح پر روشنی ڈالیے؟

2۔ الطاف حسین حالی کی خدمات بیان کیجیے؟

3۔ زبان گویا کے بارے میں اپنی معلومات قلمبند کیجیے؟

4۔ زبان گویا کا فنی تجزیہ لکھیے؟

5۔ زبان کی مہارتوں پر روشنی ڈالیے؟

6۔ زبان گویا کے سننے کی اہمیت کو بیان کیجیے۔

7۔ اسم کی تعریف مثالوں سے واضح کیجیے؟

8۔ ضمیر اور اس کی اقسام پر روشنی ڈالیے؟

1.7 مزید مطالعے کے لیے کتب

1۔ الطاف حسین حالی، صالحہ عابد حسین، نیشنل بک ٹرسٹ دہلی، 1975ء

2۔ اردو قواعد، ڈاکٹر شوکت سبزواری، مکتبہ اسلوب کراچی، 1987ء

3۔ اردو نحو و صرف، پروفیسر غلام مصطفیٰ خاں، ادارہ ثقافت اسلامیہ لاہور، 1982ء

4۔ قواعد اردو، مولوی عبدالحق، انجمن ترقی اردو دہلی، 1930ء

5۔ مقالات حالی، الطاف حسین حالی، انجمن ترقی اردو ہند، جلد اوّل، 1934ء

6۔ ترجمہ اور اس کے اصول، ڈاکٹر فرمان فتح پوری، مجلسِ ترقی ادب لاہور، 1988ء

اکائی 2 : سچ اور جھوٹ کا رزم نامہ، محمد حسین آزاد

ساخت

2.0 مقاصد

2.1 تمہید

2.2 موضوع کی وضاحت

2.2.1 متن: سچ اور جھوٹ کا رزم نامہ

2.2.2 سچ اور جھوٹ کا فنی تجزیہ

خود اکتسابی کے لیے سوالات I

2.2.3 **زبان کی مہارتیں**: سچ اور جھوٹ کا رزم نامہ کے حوالے سے پڑھنا (Reading) کی اہمیت۔

2.2.4 **قواعد**: صفت

خود اکتسابی کے لیے سوالات II

2.3 الفاظ اور معنی

2.4 خود اکتسابی سوالات کے جوابات I

خود اکتسابی سوالات کے جوابات II

2.5 خلاصہ

2.6 خود اکتسابی کے لیے مشق

تحریری سرگرمیاں: قواعد کی شناخت

کام کا تجربہ: ترجمے کی مشق

2.7 مشقی سوالات

2.8 مزید مطالعے کے لیے کتب

2.0 مقاصد

اس اکائی کے مطالعہ کے بعد طلبا سے توقع کی جاتی ہے کہ وہ.....

- ☆ محمد حسین آزاد کی شخصیت اور سوانحی حالات سے واقف ہو سکیں گے۔
- ☆ تمثیلی مضمون نگاری کے بارے میں جان سکیں گے۔
- ☆ محمد حسین آزاد کی مضمون نگاری اور اسلوب کو سمجھ سکیں گے۔
- ☆ سچ اور جھوٹ کا رزم نامہ کے متن کا فنی تجزیہ کر سکیں گے۔
- ☆ سچ اور جھوٹ کا رزم نامہ کے بنیادی خیالات، موضوعات اور پیغام سے واقف ہوں گے۔
- ☆ زبان کی مہارت پڑھنا کی اہمیت سچ اور جھوٹ کا رزم نامہ کے حوالے سے بیان کر سکیں گے۔
- ☆ قواعد کی مشقوں کے ذریعے زبان کی ساخت کو سمجھ سکیں گے۔
- ☆ صفت کی تعریف اور اقسام سے آگہی حاصل کریں۔

2.1 تمہید

اکائی دوم کا عنوان ''سچ اور جھوٹ کا رزم نامہ'' ہے جو اردو کے ممتاز ادیب، ناقد اور نثر نگار محمد حسین آزاد کا ایک تمثیلی مضمون ہے۔ محمد حسین آزاد منفرد اسلوب کے مالک ہیں۔ وہ شاعر بھی ہیں اور نثر نگار بھی۔ ان کی تحریروں میں زبان کی شستگی، انداز بیان کی دلکشی اور فکر کی گہرائی نمایاں طور پر نظر آتی ہے۔ یہ اکائی دراصل زبان سیکھنے، سمجھنے اور برتنے کی مشق کے طور پر ترتیب دی گئی ہے۔ اس میں محمد حسین آزاد کے تمثیلی مضمون کو بطور مطالعہ شامل کیا گیا ہے تا کہ طلبہ کو نثر کی زبان، اسلوب اور بیان کی مختلف جہتوں کو سمجھنے کا موقع ملے۔ اس اکائی کا بنیادی مقصد طلبہ کی اردو زبان پر مہارت پیدا کرنا ہے۔ طلبہ اس مضمون کے ذریعے زبان کی ساخت، جملوں کی ترتیب اور لفظوں کے معنوی ربط کو سمجھنے کی مشق کریں گے۔ ساتھ ہی انہیں اردو نثر کے فکری اور لسانی حسن سے روشناس کرایا جائے گا۔ محمد حسین آزاد کی نثر صاف، رواں اور سلیس اردو کی بہترین مثال ہے، اس لیے اس مضمون کا مطالعہ طلبہ کے لیے زبان سیکھنے کا ایک عملی نمونہ ثابت ہوگا۔

اکائی کے آغاز میں محمد حسین آزاد کی مختصر سوانح، شخصیت اور علمی خدمات کا تعارف پیش کیا گیا ہے تا کہ طلبہ یہ جان سکیں کہ وہ اردو نثر کے ابتدائی معماروں میں سے ایک تھے جنہوں نے زبان کو منظم، سادہ اور پر اثر بنانے میں نمایاں کردار ادا کیا۔ اس کے بعد ان کا مشہور مضمون ''سچ اور جھوٹ کا رزم نامہ'' کو شامل کیا گیا ہے۔ جس کے مطالعے سے طلبہ یہ سیکھیں گے کہ اردو نثر میں تمثیل، بیان اور کردار کے ذریعے خیالات کو کس طرح واضح اور دلچسپ بنایا جاتا ہے۔ اس اکائی میں زبان کی چار بنیادی مہارتوں میں سے خاص طور پر پڑھنے (Reading) کی مہارت پر توجہ دی گئی ہے۔ طلبہ مضمون کی قرات کے ذریعے نہ صرف معنی و مفہوم کو سمجھنے کی مشق کریں گے بلکہ متن کے بین السطور مفاہیم کو پہچاننا اور ان پر غور و فکر کرنا بھی سیکھیں گے۔ اس طرح وہ نہ صرف اچھے قاری بنیں گے بلکہ زبان کی فکری اور جمالیاتی خوبیوں کو محسوس کرنے کے اہل بھی ہوں گے۔ قواعد کے حصے میں صفت کی تعریف اور اقسام پر روشنی ڈالی گئی ہے تا کہ طلبہ جملوں میں صفات کے استعمال اور ان کے معنوی اثرات کو سمجھ سکیں۔ اس کے علاوہ خود اکتسابی مشقیں شامل کی گئی ہیں جن میں مختلف جملوں کے ذریعے اسم، ضمیر، فعل، فاعل، مفعول، محاورے اور روزمرہ کی پہچان کروائی جائے گی۔ اردو سے انگریزی ترجمے کی مشقیں بھی دی گئی ہیں تا کہ طلبہ دو زبانوں کے درمیان معنی و مفہوم کی منتقلی کا فن سیکھیں اور اپنی لسانی مہارت کو بہتر بنا سکیں۔ یوں یہ اکائی طلبہ کو اردو نثر کے مطالعے کے ساتھ ساتھ زبان کے بنیادی اصول، قواعد، فہم متن اور ترجمے کی صلاحیت کو بہتر بنانے کے لیے تیار کی گئی ہے۔ اس کے ذریعے وہ نہ صرف اردو زبان کی ساخت اور حسن کو سمجھیں گے بلکہ اپنی تحریری اور قراتی صلاحیتوں کو بھی نکھار سکیں گے۔

محمد حسین آزاد:

محمد حسین آزاد اردو ادب کی تاریخ میں ایک ایسی ہمہ جہت شخصیت ہیں جنہوں نے اپنی علمی بصیرت اور تخلیقی شعور سے اردو زبان و ادب کو ایک نئی فکری سمت عطا کی۔ وہ محض ایک ادیب نہیں بلکہ ایک مورخ، نقاد، شاعر اور انشا پرداز کے طور پر جانے جاتے ہیں۔ وہ بطور مورخ اور انشا پرداز تسلیم شدہ ہیں۔ ان کی تحریروں میں زبان کا حسن، خیال کی گہرائی اور فکر کی تازگی یکجا نظر آتی ہے۔ ان کے پر تخیل رنگ اسلوب کا ہر کوئی قائل ہے۔ محمد حسین آزاد 1830 میں دہلی میں پیدا ہوئے۔ ان کے والد مولوی محمد باقر اردو صحافت کے اولین شہید مانے جاتے ہیں۔ جنہوں نے ''دہلی اردو اخبار'' کے ذریعے اردو صحافت کی بنیاد رکھی۔ 1857 کی جنگ آزادی میں مسٹر ٹیلر کے قتل کے الزام میں انگریز حکومت نے انہیں پھانسی دے دی تھی۔ اس حادثے نے محمد حسین آزاد کی زندگی پر گہرا اثر ڈالا۔ حسین آزاد نے ابتدائی تعلیم دادا مولوی محمد اکبر سے حاصل کی اور تکمیل تعلیم قدیم دہلی کالج سے کی۔ والد کی شہادت کے بعد لکھنؤ منتقل ہوئے جہاں ایک مدت تک قیام کرنے کے بعد لاہور چلے گئے۔ ابتدا میں ڈاک کے محکمے میں ملازمت کی۔ بعد ازاں محکمہ تعلیم سے وابستہ ہوئے اور 1870 میں گورنمنٹ کالج لاہور میں عربی کے استاد مقرر ہوئے۔ اسی عرصے میں ''انجمن پنجاب'' قائم ہوئی جس کے وہ سکریٹری منتخب ہوئے۔ یہیں سے ان کی علمی و ادبی سرگرمیوں کا ایک نیا دور شروع ہوا۔

محمد حسین آزاد نے نثر و نظم کی بیشتر اصناف میں طبع آزمائی کی۔ ان کی مطبوعہ اور غیر مطبوعہ تصانیف کی تعداد خاصی زیادہ ہے۔ انہوں نے اردو میں مجلسی تنقید کی روایت کا آغاز کیا جس میں اہل ذوق باقاعدہ مجالس میں شعری و ادبی موضوعات پر گفتگو کرتے تھے۔ وہ اردو شاعری میں مقصدیت اور افادیت کے قائل تھے۔ انہوں نے شاعری کو محض جذباتی اظہار کے بجائے سماجی اور اخلاقی اصلاح کا وسیلہ بنایا۔ اردو زبان کی تاریخ کے حوالے سے وہ سب سے پہلے مفکر ہیں جنہوں نے اردو کی پیدائش کا باقاعدہ نظریہ پیش کیا اور اس کے فروغ کے لیے انگریزی زبان و ادب سے استفادے پر زور دیا۔ آزاد نے نثر و نظم دونوں میں اپنی تخلیقی انفرادیت کے نقوش چھوڑے۔ ان کی مشہور تصانیف میں آب حیات، نیرنگ خیال، دربار اکبری، سخندان فارس، نگارستان فارس، قصص ہند، سیر ایران اور دیوان ذوق شامل ہیں البتہ ان کی کتاب آب حیات کو سب سے زیادہ شہرت ملی۔ یہ اردو شاعری کی پہلی منظّم تاریخ ہے جس میں نہ صرف شعرا کے تذکرے ہیں بلکہ اردو شاعری کے ارتقا کی فکری و فنی بنیادیں بھی بیان کی گئی ہیں۔ نیرنگ خیال میں ان کی انشا پردازانہ شوکت اور تخیل کی رنگینی اپنے عروج پر ہے، جب کہ دربار اکبری میں انہوں نے تاریخ نویسی کو ایک فنی اور ادبی جہت دی۔

آزاد کے اسلوب میں تخیل کی جولانی، زبان کی چمک دمک اور بیان کی نفاست ایک خاص توازن کے ساتھ جلوہ گر ہے۔ وہ فارسی زبان و ادب پر گہری دسترس رکھتے تھے اسی لیے ان کی نثر میں فارسی کی لطافت اور اردو کی روانی دونوں کا حسین امتزاج ملتا ہے۔ ان کے جملے فصاحت و بلاغت سے مزین ہوتے ہیں اور ان کے بیان میں خطابت کی شان بھی نمایاں ہے۔ وہ انشا پردازی کو محض زبان کا کھیل نہیں سمجھتے تھے بلکہ اسے تہذیبی شعور اور فکری بالیدگی کا آئینہ تصور کرتے تھے۔ 1910 میں محمد حسین آزاد اس دار فانی سے رخصت ہوئے۔ ان کی علمی و ادبی خدمات کے اعتراف میں انہیں ''شمس العلماء'' کا خطاب دیا گیا۔ بلاشبہ محمد حسین آزاد وہ شخصیت ہیں جنہوں نے اردو ادب کو نہ صرف نئی فکری جہت دی بلکہ آنے والی نسلوں کے لیے ایک روشن روایت بھی قائم کی۔

2.2 موضوع کی وضاحت

2.2.1 متن: سچ اور جھوٹ کا رزم نامہ

عہد قدیم کے مؤرخ لکھتے ہیں کہ اگلے زمانہ میں فارس کے شرفا اپنے بچوں کے لئے تین باتوں کی تعلیم میں بڑی کوشش کرتے تھے۔ شہ سواری، تیراندازی اور راست بازی۔ شہ سواری اور تیراندازی تو بے شک سہل آجاتی ہوگی، مگر کیا اچھی بات ہوتی کہ اگر ہمیں معلوم ہو جاتا کہ راست بازی کن کن طریقوں سے سکھاتے تھے اور وہ کون سی سپر تھی کہ جب دروغ دیوزاد آکر ان کے دلوں پر شیشہ جادو مارتا تھا، تو یہ اس چوٹ سے اس کی اوٹ میں بچ جاتے تھے۔

اس میں شک نہیں کہ دنیا بری جگہ ہے۔ چند روزہ عمر میں بہت سی باتیں پیش آتی ہیں جو اس مشت خاک کو اس دیو آتش زاد کی اطاعت کے لئے مجبور کرتی ہیں۔ انسان سے اکثر ایسا جرم ہو جاتا ہے کہ اگر قبولے تو مرنا پڑتا ہے، ناچار مکر نا پڑتا ہے، کبھی ابلہ فریبی کر کے جاہلوں کو پھنساتا ہے۔ جب لقمہ رزق کا پاتا ہے۔ اس کے علاوہ بہت مزے دنیا کے ہیں کہ مکر و دغا ان کی چاٹ لگاتی ہے اور جزوی جزوی خطائیں ہو جاتی ہیں جن سے مکرتے ہی بن آتی ہے۔ غرض بہت کم انسان ہوں گے جن میں یہ حوصلہ و استقلال ہو کہ راستی کے راستے میں ہر دم ثابت قدم ہی رہیں۔

یہ بھی یاد رہے کہ انسان کے سچ بولنے کے لئے سننے والے بھی ضرور ہیں، کیوں کہ خوشامد جس کی دکان میں آج موتی برس رہے ہیں اس سے زیادہ جھوٹ کیا ہوگا اور کون ایسا ہے جو اس کی قید کا زنجیر نہیں۔ ڈرپوک بیچارا ڈر کا مارا خوشامد کرتا ہے۔ تابع دار امید کا بھوکا آقا کو خوش کر کے پیٹ بھرتا ہے۔ دوست محبت کا بندہ ہے۔ اپنے دوست کے دل میں اسی سے گھر کرتا ہے۔ بہت ایسے بھی ہیں کہ نہ غلام ہیں، نہ ڈرپوک ہیں انہیں باتوں باتوں میں خوش کر دینے ہی کا شوق ہے۔ اسی طرح جب جلسوں میں نمودیے گدھوں کے دعوے بل ڈاگ کی آواز سے کئی میدان آگے نکل جاتے ہیں، تو ان میں وہ لوگ بھی ہوتے ہیں جنہیں کچھ امید، کچھ ڈر، کچھ مروت سے غرض چار و ناچار، کبھی

ان کے ساتھ، کبھی پیچھے پیچھے دوڑنا پڑتا ہے۔
آج کل تو یہ حال ہے کہ جھوٹ کی عملداری دور دور تک پھیل گئی ہے بلکہ جن صاحب تمیزوں کو قوت عقلی جھوٹ نہیں بولنے دیتی اور خود اس مردار سے متنفر ہیں وہ بھی اسی کے حامی ہو کر اوروں کے اخلاق خراب کرتے ہیں۔
سچ کا عجب حال ہے کہ اتنا تو اچھا ہے، مگر پھر بھی لوگ اسے ہر وقت اچھا نہیں سمجھتے، چنانچہ جب کسی شے پر دل آتا ہے اور سچ اس کے برخلاف ہوتا ہے تو اس وقت سچ سے زیادہ کوئی برا نہیں معلوم ہوتا ہے۔ اصل یہ ہے کہ حضرت انسان کو حقیقت اور واقعیت سے کچھ غرض نہیں، جس چیز کو جی نہیں چاہتا اس کا جاننا بھی نہیں چاہتے۔ جو بات پسند نہیں آتی اس کا ذکر بھی نہیں سنتے، اس کان سنتے ہیں اس کان سے نکال دیتے ہیں۔ حکیموں نے جھوٹ سے متنفر ہونے کی بہت سی تدبیریں نکالی ہیں، جس طرح بچوں کو کڑوی دوا ملا کر کھلاتے ہیں، اسی طرح انواع واقسام کے رنگوں میں اس کی نصیحتیں کی ہیں تاکہ لوگ اسے ہنستے کھیلتے چھوڑ دیں۔
واضح ہو کہ ملکہ صداقت زمانی سلطان آسمانی کی بیٹی تھی جو کہ ملکہ دانش خاتون کے پیٹ سے پیدا ہوئی تھی۔ جب ملکہ موصوفہ نے ہوش سنبھالا تو اول تعلیم وتربیت کے سپرد ہوئی۔ جب انہوں نے اس کی پرورش میں اپنا حق ادا کر دیا تو باپ کے دربار میں سلام کو حاضر ہوئی۔ اسے نیکی اور نیک ذاتی کے ساتھ خوبیوں اور محبوبیوں کے زیور سے آراستہ دیکھ کر سب نے صدق دل سے تعریف کی۔ عزت عام کا تاج مرصع سر پر رکھا گیا اور حکم ہوا کہ جاؤ اولاد آدم میں اپنا نور پھیلاؤ۔ عالم سفلی میں دروغ دیوزاد ایک سفلہ نابکار تھا کہ حمق تیرہ دماغ اس کا باپ تھا اور ہوس پرست اس کی ماں تھی۔ اگرچہ اسے دربار میں آنے کی اجازت نہ تھی، مگر جب کسی تفریح کی صحبت میں تمسخر اور ظرافت کے بھانڈ آیا کرتے تھے تو ان کی سنگت میں وہ بھی آجاتا تھا۔ اتفاقاً اس دن وہ بھی آیا ہوا تھا اور بادشاہ کو ایسا خوش کیا تھا کہ اسے ملبوس خاص کا خلعت مل گیا تھا۔ یہ منافق دل میں سلطان آسمانی سے سخت عداوت رکھتا تھا، ملکہ کی قدر ومنزلت دیکھ کر اسے حسد کی آگ نے بھڑکایا۔ چنانچہ وہاں سے چپ چپاتے نکلا اور ملکہ کے عمل میں خلل ڈالنے کو ساتھ ساتھ روانہ ہوا۔ جب یہ دو دعوے دار نئے ملک اور نئی رعیت کے تسخیر کرنے کو اٹھے تو چونکہ بزرگان آسمانی کو ان کی دشمنی کی بنیاد ابتدا سے معلوم تھی، سب کی آنکھیں ادھر لگ گئیں کہ دیکھیں ان کی لڑائی کا انجام کیا ہو؟
سچ کے زور وطاقت کو کون نہیں جانتا۔ چنانچہ ملکہ صداقت کو بھی حقیقت کے دعوے تھے، اٹھی اور اپنے زور میں بھری ہوئی اٹھی اسی واسطے بلند اٹھی، اکیلی آئی اور کسی کی مدد ساتھ نہ لائی۔ ہاں آگے آگے فتح واقبال نور کا غبار اڑاتے آتے تھے اور پیچھے پیچھے اور ایک پر پرواز تھا۔ مگر صاف معلوم ہوتا تھا کہ تابع ہے شریک نہیں۔ ملکہ کی شان شاہانہ تھی، اور دبدبہ خسروانہ تھا۔ اگرچہ آہستہ آہستہ آتی تھی مگر استقلال کا رکاب پکڑے تھا۔ اور جو قدم اٹھتا تھا دس قدم آگے پڑتا نظر آتا تھا۔ ساتھ اس کے جب ایک دفعہ جم جاتا تھا، تو انسان کیا فرشتہ سے بھی نہ ہٹ سکتا تھا۔
دروغ دیوزاد بہروپ بدلنے میں طاق تھا، ملکہ کی ہر بات کی نقل کرتا تھا اور نئے نئے سوانگ بھرتا تو وضع اس کی گھبرائی ہوئی معلوم ہوتی تھی۔ دنیا کی ہوا وہوس ہزاروں رسالے اور پلٹنیں اس کے ساتھ لیے تھیں اور چوں کہ یہ ان کی مدد کا محتاج تھا اسی لالچ کا مارا کمزور تابع داروں کی طرح ان کے حکم اٹھاتا تھا۔ ساری حرکتیں اس کی بے معنی تھیں اور کام بھی الٹ پلٹ بے اوسان تھے۔ کیونکہ استقلال ادھر نہ تھا۔ اپنی شعبدہ بازی اور نیرنگ سازی سے فتح یاب تو جلد ہو جاتا تھا مگر تھم نہ سکتا تھا، ہوا وہوس اس کے یار وفادار تھے اور اگر کچھ تھے تو وہی سنبھالے رہتے تھے۔
کبھی کبھی ایسا بھی ہو جاتا تھا کہ دونوں کا آمنا سامنا ہو کر سخت لڑائی آپڑتی تھی اس وقت دروغ دیوزاد اپنی دھوم دھام بڑھانے کے لئے سر پر بادل کا دھواں دھار پگڑ لپیٹ لیتا تھا۔ لاف وگزاف کو حکم دیتا کہ شیخی اور نمود کے ساتھ آگے جا کر غل مچانا شروع کر دو۔ ساتھ ہی دغا کو اشارہ کر دیتا تھا کہ گھات لگا کر بیٹھ جاؤ۔ دائیں ہاتھ میں طراری کی تلوار، بائیں ہاتھ میں بے حیائی کی ڈھال ہوتی تھی۔ غلط نما تیروں کا ترکش آویزاں ہوتا تھا۔ ہوا وہوس دائیں بائیں دوڑتے پھرتے تھے۔ دل کی ہٹ دھرمی، بات کی پچ پیچھے سے زور لگاتے تھے۔ غرض کبھی

مقابلہ کرتا تھا تو ان زوروں کے بھروسے پر کرتا تھا اور باوجود اس کے کہ ہمیشہ یہی چاہتا تھا کہ دور دور سے لڑائی ہو۔ میدان میں آتے ہی تیروں کی بوچھاڑ کر دیتا تھا، مگر وہ بھی بادہوائی، اٹکل پچو بے ٹھکانے ہوتے تھے۔ خود ایک جگہ پر نہ ٹھہرتا تھا۔ دم بدم جگہ بدلتا تھا، کیونکہ حق کی کمان سے جب تیر نظر اس کی طرف سر ہوتا تھا تو جھٹ تاڑ جاتا تھا۔ ملکہ کے ہاتھ میں اگرچہ باپ کی کڑک بجلی کی تلوار نہ تھی، مگر تو بھی چہرہ ہیبت ناک تھا اور رعب خداداد کا خود سر پر دھرا تھا۔ جب معرکہ مار کر ملکہ فتح یاب ہوتی تھی تو یہ شکست نصیب اپنے تیروں کا ترکش پھینک، بے حیائی کی ڈھال منہ پر لئے، ہوا و ہوس کی بھیڑ میں جا کر چھپ جاتا تھا۔ نشان لشکر گر پڑتا تھا اور لوگ پھریرا پکڑے زمین پر گھسیٹتے پھرتے تھے۔ ملکہ صداقت زمانی کبھی کبھی زخمی بھی ہوتی تھی مگر سانچ کو آنچ نہیں، زخم جلد بھر آتے تھے اور وہ جھوٹا نابکار جب زخم کھاتا تھا تو ایسے سڑتے تھے کہ اوروں میں بھی وبا پھیلا دیتے تھے۔ مگر ذرا انگور بندھے اور پھر میدان میں آ کودا۔

دروغ دیوزاد نے تھوڑے ہی تجربہ میں معلوم کر لیا تھا کہ بڑائی اور دانائی کا پردہ اسی میں ہے کہ ایک جگہ نہ ٹھہروں۔ اس لئے دھوکہ بازی اور شبہ کاری کو حکم دیا کہ ہمارے چلنے پھرنے کے لئے ایک سڑک تیار کرو، مگر اس طرح کے ایچ پیچ اور ہیر پھیر دے کر بناؤ کہ شاہراہ صداقت جو خط مستقیم میں ہے اس سے کہیں نہ ٹکرائے۔ چنانچہ جب اس نابکار پر کوئی حملہ کرتا تھا تو اسی راستے سے جدھر چاہتا تھا نکل جاتا تھا اور جدھر سے چاہتا تھا پھر آن موجود ہوتا تھا۔

ان رستوں سے اس نے ساری دنیا پر حملے کرنا شروع کر دیے اور بادشاہت اپنی تمام عالم میں پھیلا کر دروغ شاہ دیوزاد کا لقب اختیار کیا۔ جہاں جہاں فتح پاتا تھا ہوا و ہوس کو اپنا نائب چھوڑتا اور آپ فوراً کھسک جاتا۔ وہ اس فرماں روائی سے بہت خوش ہوتے تھے اور جب ملکہ کا لشکر آتا تھا تو بڑی گھاتوں سے مقابلے کرتے تھے۔ جھوٹی قسموں کی ایک لمبی زنجیر بنائی تھی۔ سب اپنی کمریں اس سے جکڑ لیتے تھے کہ ہرگز ایک دوسرے کا ساتھ نہ چھوڑیں گے۔ مگر سچ کے سامنے جھوٹ کے پاؤں کہاں؟ لڑتے تھے اور متابعت کر کے ہٹتے تھے۔ پھر ادھر ملکہ نے منہ پھیرا، ادھر باغی ہو گئے۔ ملکہ جب آسمان سے نازل ہوئی تھی تو سمجھتی تھی کہ بنی آدم میرے آنے سے خوش ہوں گے، جو بات سنیں گے اسے مانیں گے اور حکومت میری تمام عالم میں پھیل کر مستقل ہو جائیگی۔ مگر یہاں دیکھا کہ گزارہ بھی مشکل ہے۔ لوگ ہٹ دھرمی کے بندے ہیں اور ہوا و ہوس کے غلام ہیں اور اس میں بھی شک نہیں کہ ملکہ کی حکومت آگے بڑھتی تھی مگر بہت تھوڑی تھوڑی۔ اس پر بھی یہ دشواری تھی کہ ذرا اس طرف ہٹی اور پھر بدعملی ہو گئی کیونکہ ہوا و ہوس جھٹ بغاوت کا نقارہ بجا دشمن کے زیر علم جا موجود ہوتے تھے۔ ہر چند ملکہ صداقت زمانی ان باتوں سے کچھ دبتی نہ تھی کیوں کہ اس کا زور کسی کے بس کا نہ تھا، مگر جب بار بار ایسے کمینے پاجی کو اپنے مقابلہ پر دیکھتی تھی اور اس میں سوائے مکر و فریب اور کمزوری و بے ہمتی کے اصالت اور شجاعت کا نام نہ پاتی تھی تو گھٹتی تھی اور دل میں پیچ و تاب کھاتی تھی۔ جب سب طرح سے ناامید ہوئی تو غصہ ہو کر اپنے باپ سلطان آسمانی کو لکھا کہ آپ مجھے اپنے پاس بلا لیجئے۔ دنیا کے لوگ اس شیطان کے تابع ہو کر جن بلاؤں میں خوش ہیں ان ہی میں رہا کریں۔ اپنے کئے کی سزا آپ پالیں گے۔ سلطان آسمانی اگرچہ اس عرضی کو پڑھ کر بہت خفا ہوا مگر پھر بھی کوتاہ اندیشوں کے حال پر ترس کھایا اور سمجھا کہ اگر سچ کا قدم دنیا سے اٹھا تو جہان اندھیر اور تمام عالم تہ و بالا ہو جائیگا، چنانچہ اس خیال سے اس کی عرض نامنظور کی۔ ساتھ اس کے یہ بھی گوارہ نہ ہوا کہ میرے جگر کا ٹکڑا جھوٹے بداصلوں کے ہاتھوں یوں مصیبت میں گرفتار رہے۔ اسی وقت عالم بالا کے پاک نہادوں کو جمع کر کے ایک انجمن منعقد کی۔ اس میں دو امر تنقیح طلب قرار پائے۔

(۱) کیا سبب ہے کہ ملکہ کی کارروائی اور فرماں فروائی دنیا میں ہر دل عزیز نہیں۔

(۲) کیا تدبیر ہے جس سے اس کے آئین حکومت کو جلد اہل عالم میں رسائی ہو اور اسے بھی ان تکلیفوں سے رہائی ہو۔

کمیٹی میں یہ بات کھلی کہ درحقیقت ملکہ کی طبیعت میں ذرا سختی ہے اور کارروائی میں تلخی ہے۔ صدر انجمن نے اتفاق رائے کر کے اس قدر زیادہ کہا کہ ملکہ کے دماغ میں اپنی حقیت کے دعوؤں کا دھواں اس قدر بھرا ہوا ہے کہ وہ ہمیشہ ریل گاڑی کی طرح سیدھے خط میں چل کر

کامیابی چاہتی ہیں، جس کا زور طبیعتوں کو سخت اور دھواں آنکھوں کو کڑوا معلوم ہوتا ہے۔ بعض اوقات لوگوں کو اس کی راستی سے نقصان اٹھانے پڑتے ہیں۔ کبھی ایسے فساد اٹھ کھڑے ہوتے ہیں جن کا سنبھالنا مشکل ہو جاتا ہے اور یہ زمانہ ایسا ہے کہ دور اندیشی اور صلاح وقت کے بغیر کام نہیں چلتا، پس اسے چاہئے کہ جس طرح ہو سکے اپنی سختی اور تلخی کی اصلاح کرے۔ جب تک یہ نہ ہوگا لوگ اس کی حکومت کو رغبت سے قبول نہ کریں گے کیوں دیو دروغ کی حکومت کا ڈھنگ بالکل اس کے خلاف ہے۔ اول تو اس میں فارغ البالی بہت ہے اور جو لوگ اس کی رعایا میں داخل ہو جاتے ہیں، انہیں سوائے عیش و آرام کے دنیا کی کسی بات سے خبر نہیں ہوتی۔ دوسرے وہ خود بہروپیہ ہے۔ جو صورت سب کو بھائے وہی روپ بھر لیتا ہے اور اوروں کی مرضی کا جامہ پہنے رہتا ہے۔ غرض اہل انجمن نے صلاح کر کے ملکہ کی طرز لباس بدلنے کی تجویز کی۔ چنانچہ ایک ویسا ہی ڈھیلا ڈھالا جامہ تیار کیا جیسا کہ جھوٹ پہنتا تھا اور وہ پہن کر لوگوں کو جل دیا کرتا تھا۔ اس جامہ کا مصلحت زمانہ نام ہوا۔ چنانچہ اس خلعت کو زیب بدن کر کے ملکہ پھر ملک گیری کو اٹھی۔ جس ملک میں پہنچتی اور آگے کو راستہ مانگتی، ہوا وہوس حاکم وہاں کے اسے دروغ شاہ دیوزاد سمجھ کر آتے اور شہر کی کنجیاں نذر گزرانتے۔ ادھر اس کا دخل ہوا، ادھر ادراک آیا اور جھٹ وہ جامہ اتار لیا۔ جامہ کے اترتے ہی اس کی اصل روشنی اور ذاتی حسن و جمال پھر چمک کر نکل آیا۔

چنانچہ اب یہی وقت آ گیا ہے، یعنی جھوٹ اپنی سیاہی کو ایسا رنگ آمیزی کر کے پھیلاتا ہے کہ سچ کی روشنی کو لوگ اپنی آنکھوں کے لئے مضر سمجھنے لگے ہیں۔ اگر سچ کہیں پہنچ کر اپنا نور پھیلانا چاہتا ہے تو پہلے جھوٹ سے کچھ زرق برق کے کپڑے مانگ تانگ کر لاتا ہے۔ جب تبدیل لباس کر کے وہاں جا پہنچتا ہے تو وہ لفافہ اتار کر پھینک دیتا ہے۔ پھر اپنا اصلی نور پھیلاتا ہے کہ جھوٹ کی قلعی کھل جاتی ہے۔ (ماخذ: نیرنگ خیال حصہ اول)

1.2.2 سچ اور جھوٹ کا رزم نامہ کا فنی تجزیہ:

محمد حسین آزاد اپنے پر تخیل اسلوب نگارش کی وجہ سے اردو ادب میں منفرد مقام رکھتے ہیں۔ ان کی تصنیف نیرنگ خیال اردو ادب میں ایک سنگ میل کی حیثیت رکھتی ہے۔ یہ کتاب بنیادی طور پر انگریزی زبان کے تمثیلی مضامین کے تراجم پر مشتمل ہے، مگر محمد حسین آزاد نے اپنی ذہانت، تخیل اور سحر بیانی سے ان میں اس قدر رنگ آمیزی کی کہ وہ محض ترجمہ نہیں بلکہ تخلیق کی حیثیت اختیار کر گئی ہے۔ آزاد نے یہ مضامین 1875 میں لکھنا شروع کیا۔ ان میں سے کچھ مضامین انجمن مفید عام کے رسالے میں 1875 سے 1877 کے دوران شائع ہوئے اور بعد میں ان کا مجموعہ نیرنگ خیال (حصہ اول) کی صورت میں 1880 میں منظر عام پر آیا۔ آزاد اس کے دوسرے حصے پر بھی کام کر رہے تھے لیکن ان کے انتقال کے باعث وہ مکمل نہ ہو سکا۔ بعد ازاں ان کے پوتے آغا محمد طاہر نے پانچ غیر مطبوعہ مضامین ان کے کاغذات سے نکال کر 1923 میں حصہ دوم کے طور پر شائع کیے۔ نیرنگ خیال میں شامل مضامین میں سے چھ جانسن، تین ایڈیسن اور باقی دیگر انگریزی مصنفین سے لیے گئے ہیں۔ لیکن آزاد نے ترجمے کی سطح پر محض لفظی ترسیل نہیں کی بلکہ اس میں اپنی تخلیقی قوت، مشرقی رنگ، ہندوستانی معاشرت اور اردو نثر کی لطافت شامل کر کے اسے اردو ادب کا حصہ بنا دیا۔ نیرنگ خیال کے مشہور مضامین میں سیر زندگی، انسان کسی حال میں خوش نہیں رہتا، علوم کی بدنصیبی، شہرت عام بقائے دوام کا دربار، گلشن امید کی بہار، آغاز آفرینش میں باغ عالم کا کیا رنگ تھا اور سچ اور جھوٹ کا رزم نامہ وغیرہ شامل ہیں۔ ان سب میں اخلاقی، اصلاحی اور فلسفیانہ پہلو نمایاں ہیں جنہیں تمثیل کے پیرائے میں پیش کیا گیا ہے۔

محمد حسین آزاد کا مضمون 'سچ اور جھوٹ کا رزم نامہ' اردو نثر کی تمثیلی روایت میں ایک اہم اور انوکھا تجربہ ہے۔ اس میں آزاد نے سچ اور جھوٹ جیسے مجرد اخلاقی تصورات کو جیتی جاگتی پیکر کی صورت میں پیش کر کے انسان کی داخلی اور اجتماعی زندگی کی دائمی کشمکش کو علامتی انداز میں بیان کیا ہے۔ واضح ہے کہ یہ جانسن کے مضمون Truth Falsehood and Fiction an Allegory کا تخلیقی ترجمہ ہے۔ کہانی کا مرکزی خاکہ نہایت دلچسپ ہے۔ ملکہ صداقت یعنی سچ، سلطان آسمانی کی بیٹی ہے اور اس کے مقابل دروغ دیوزاد یعنی جھوٹ ہے، جو ہوس وحماقت کی اولاد ہے۔ دونوں کے درمیان دنیا کی حکومت پر قبضے کی جنگ جاری رہتی ہے، جس میں کبھی جھوٹ اپنی

عیاری وفریب سے غالب آنے کی کوشش کرتا ہے۔ بالآخر سچ کی روشنی ہی غالب رہتی ہے۔ آخر میں جب سچ کو یہ احساس ہوتا ہے کہ اس کی سختی اور تلخی کی وجہ سے لوگ اس سے دور بھاگتے ہیں تو وہ زمانے کے مصلحتی لباس میں ظاہر ہوکر انسانوں کے درمیان اپنی جگہ بناتا ہے۔

یہ مضمون اپنی فنی ساخت کے اعتبار سے اردو نثر کے ابتدائی دور میں تمثیل نگاری کی نہایت پختہ مثال ہے۔ آزاد نے انگریزی ادب کی الیگری (Allegory) سے اثر قبول کیا مگر اسے اپنے لسانی تخیل اور ہندوستانی تہذیبی رنگ سے اتنا نیا قالب عطا کر دیا کہ یہ محض ترجمہ نہیں بلکہ ایک مکمل تخلیق بن گیا۔ تمثیل کی خوبی یہ ہے کہ اس میں کردار علامت بنتے ہیں بلکہ صداقت اخلاقی بلندی، استقلال اور روشنی کی علامت ہے، جبکہ دروغ دیوزاد انسان کے اندر چھپے ہوئے فریب، خودغرضی اور ہوس کی نمائندگی کرتا ہے۔ ان دونوں کرداروں کی جنگ دراصل انسانی روح اور نفس کے درمیان ازلی جدوجہد کا استعارہ ہے۔ مضمون کی زبان فصاحت و بلاغت سے بھرپور اور شاعرانہ تخیل سے لبریز ہے۔ آزاد نے سچ اور جھوٹ کی معرکہ آرائی کو ایسے مناظر میں پیش کیا ہے کہ نثر خود بہ خود نظم کا سا تاثر پیدا کرتی ہے۔ تشبیہوں اور استعارات کے استعمال نے اس مضمون کو ایک تصویری کیفیت دے دی ہے۔ جملوں میں روانی، توازن اور آہنگ موجود ہے۔ آزاد کا اسلوب کہیں خطیبانہ ہے، کہیں مکالماتی اور کہیں قصہ گوئی کا رنگ اختیار کر لیتا ہے۔ اسی امتزاج نے مضمون میں ڈرامائیت پیدا کر دی ہے۔ کہانی میں مکالمے اور منظر نگاری کی فنی نزاکتیں بھی قابل توجہ ہیں۔ جھوٹ کا فریب، ہوا و ہوس کی معاونت، ملکہ کی استقامت اور بالآخر اس کی اخلاقی فتح یہ سب ایسے واقعات کی صورت میں بیان ہوئے ہیں کہ قاری ایک تخیلاتی جہان میں داخل ہو جاتا ہے۔ راوی کبھی ناظر کی طرح واقعات کو بیان کرتا ہے، کبھی فلسفیانہ تبصرے کرتا ہے اور کبھی انسانی کمزوریوں پر طنزیہ تبسم بھی بکھیر دیتا ہے۔ یہی رنگ آزاد کی انشائیہ نگاری کا خاصہ ہے کہ وہ وعظ و نصیحت کو براہ راست نہیں بلکہ تخیل کی لطافت سے پیش کرتے ہیں۔

مضمون کی فنی اہمیت اس لحاظ سے بھی ہے کہ یہ اردو افسانے کا اولین نقش تصور کیا جاتا ہے۔ کردار، مکالمہ، منظر، کشمکش، انجام یہ سب عناصر افسانوی ساخت کی نشاندہی کرتے ہیں۔ تاہم آزاد نے اس فنی ڈھانچے کو اخلاقی نصب العین کے تابع رکھا ہے۔ ان کے نزدیک ادب کا مقصد محض تفریح نہیں بلکہ تہذیبی تربیت اور اخلاقی شعور کی بیداری ہے۔ یہی وجہ ہے کہ مضمون کے آخر میں سچ کی فتح محض تمثیلی انجام نہیں بلکہ ایک اخلاقی اعلان ہے کہ جھوٹ کی فریب کاری وقتی ہے، مگر سچ کا نور ابدی۔ فن کے لحاظ سے یہ مضمون نثر کی لطافت، اسلوب کی جاذبیت، علامت کی گہرائی اور تمثیل کی بصیرت کا حسین امتزاج ہے۔ آزاد نے فلسفہ اخلاق کو ایسی داستانی زبان میں بیان کیا ہے جو نہ صرف دل کو چھوتی ہے بلکہ فکر کو جھنجھوڑ دیتی ہے۔ سچ اور جھوٹ کا رزم نامہ اس لحاظ سے آزاد کے نثر پاروں میں وہ مثال ہے جس نے اردو انشائیہ کو شاعرانہ حسن، تمثیلی ساخت اور فکری رفعت سے آشنا کیا۔ یہ مضمون ثابت کرتا ہے کہ محمد حسین آزاد نے نہ صرف اردو نثر کو نئی فنی وسعتیں عطا کیں بلکہ تمثیل کے ذریعے اردو ادب کو فکری وقار اور اخلاقی رفعت سے بھی آشنا کیا۔

خود اکتسابی کے لیے سوالات I

خالی جگہیں پر کیجیے۔

1۔ محمد حسین آزاد ۔۔۔۔ کو دہلی میں پیدا ہوئے۔

2۔ محمد مولوی محمد باقر اردو کے اولین ۔۔۔۔ صحافی مانے جاتے ہیں۔

3۔ نیرگ خیال کا پہلا حصہ ۔۔۔۔ میں شائع ہوا۔

4۔ سچ اور جھوٹ کا رزم نامہ ۔۔۔۔ کے مضمون سے ماخوذ ہے۔

5۔ سچ اور جھوٹ کے رزم نامہ میں سچ کو ۔۔۔۔ اور جھوٹ کو ۔۔۔۔ کے نام سے پیش کیا گیا ہے۔

6۔ نیرگ خیال ۔۔۔۔ مضامین کا مجموعہ ہے۔

7۔ محمد حسین آزاد نے اردو کی پیدائش کا نظریہ ۔۔۔۔ میں پیش کیا ہے۔

8۔ سچ اور جھوٹ کا رزم نامہ کو ۔۔۔۔ کا اولین نقوش تصور کیا جاتا ہے۔

9۔ ملکہ صداقت زمانی کا کردار دراصل ۔۔۔۔۔کی علامت ہے۔

10۔ نیرنگ خیال کے دوسرے حصے کو۔۔۔۔۔نے مرتب کیا۔

11۔ علوم کی بدنصیبی۔۔۔۔۔کا مضمون ہے۔

12۔ محمد حسین آزاد کا انتقال 1910 میں۔۔۔۔۔میں ہوا۔

13۔ ۔۔۔۔۔بہروپ بدلنے میں طاق تھا۔

1.2.3 زبان کی مہارتیں: سچ اور جھوٹ کا رزنامہ کے حوالے سے پڑھنے کی اہمیت

زبان انسان کے اظہار خیال اور تفہیم احساس کا سب سے لطیف وسیلہ ہے۔ یہی وہ آئینہ ہے جس میں انسانی فکر و شعور کی جھلک نمایاں ہوتی ہے۔ زبان کو سمجھنے اور برتنے کے لیے مختلف مہارتوں کی ضرورت پیش آتی ہے۔ جن میں سے پڑھنے (Reading) کی مہارت نہایت بنیادی اور اہم حیثیت رکھتی ہے۔ پڑھنا صرف الفاظ کو پہچاننے یا جملوں کو دہرانے کا عمل نہیں بلکہ یہ ذہن اور دل کی وہ ہم آہنگی ہے جس کے ذریعے قاری تحریر کے ظاہر سے باطن تک رسائی حاصل کرتا ہے۔ یہی عمل قاری کو اس قابل بناتا ہے کہ وہ متن کے پس منظر، مصنف کے انداز فکر اور زبان کے جمالیاتی رنگ کو سمجھ سکے۔ جب کوئی طالب علم کسی تحریر کو پڑھتا ہے تو دراصل وہ لفظوں کے باطن میں اترنے کی مشق کر رہا ہوتا ہے۔ ہر جملہ اس کے ذہن میں ایک نئی معنوی فضا پیدا کرتا ہے۔ یہی فضا بعد میں اس کے اظہار، تخیل اور تجزیاتی صلاحیت کا حصہ بن جاتی ہے۔ اس لیے تعلیم کے میدان میں پڑھنے کی مہارت کو بنیادی ستون کی حیثیت حاصل ہے۔ یہ نہ صرف علم کے دروازے کھولتی ہے بلکہ زبان کے ذوق کو نکھارتی، فکر کو جلا بخشتی اور انسان کے اندر سمجھنے اور پرکھنے کا شعور بیدار کرتی ہے۔

محمد حسین آزاد کا مضمون ''سچ اور جھوٹ کا رزم نامہ'' اردو نثر کا ایک ایسا شاہکار ہے جس کے مطالعے سے پڑھنے کی مہارت کے تمام پہلو عملی طور پر سمجھ میں آتے ہیں۔ آزاد نے اس تحریر میں سچ اور جھوٹ کو دو علامتی کرداروں کی صورت میں پیش کیا ہے جو انسانی سماج، اخلاقیات اور کردار کی کشمکش کی نمائندگی کرتے ہیں۔ بظاہر یہ تمثیل ہے مگر اس کے پس منظر میں انسانی زندگی کی گہری معنویت پوشیدہ ہے۔ یہی وہ نکتہ ہے جہاں قاری کا عمل الفاظ کی شناخت سے آگے بڑھ کر تفہیم و تجزیے کے عمل میں تبدیل ہو جاتا ہے۔ جب طلبہ اس مضمون کو پڑھتے ہیں تو وہ کئی جہتوں سے زبان کی باریکیوں کو سمجھنے کے قابل ہوتے ہیں۔ سب سے پہلے وہ الفاظ کی ساخت، صوتی آہنگ، تلفظ کی صحت اور عبارت کی روانی کو محسوس کرتے ہیں۔ آزاد کی نثر میں ایک مخصوص آہنگ، ترتیب اور لفظی توازن پایا جاتا ہے۔ یہ توازن پڑھنے والے کو زبان کی ترکیب و نحوی ساخت سمجھنے میں مدد دیتا ہے۔ دوسرا فائدہ یہ ہے کہ طلبہ آزاد کی تحریر کے ذریعے محاوروں، تلمیحات، تشبیہوں اور استعاروں کے حسن سے آشنا ہوتے ہیں۔ سچ اور جھوٹ کا رزم نامہ میں ہر جملہ کسی نہ کسی اخلاقی یا سماجی تجربے کا آئینہ دار ہے۔ پڑھنے والا اگر باریک بینی سے مطالعہ کرے تو اسے محسوس ہوتا ہے کہ اردو نثر محض اطلاع کا ذریعہ نہیں بلکہ تخلیقی اور اخلاقی اظہار کا آلہ بھی ہے۔

پڑھنے کی مہارت قاری کو سمجھنے کے مختلف مدارج سے روشناس کراتی ہے۔ سب سے پہلا درجہ سطحی فہم ہے، جس میں قاری لفظی معنی سمجھتا ہے۔ اگلا درجہ گہرے فہم کا ہے جہاں قاری مصنف کے منشا، اسلوب اور جذبے کو محسوس کرنے لگتا ہے۔ آزاد کے اس مضمون میں سچ اور جھوٹ کی کشمکش محض اخلاقی تمثیل نہیں بلکہ انسانی فطرت کی پرتوں کا بیان ہے۔ اس فہم تک پہنچنے کے لیے قاری کو بار بار پڑھنا، رکنا، سوچنا اور متن سے ہم آہنگ ہونا پڑتا ہے یہی وہ مشق ہے جو پڑھنے کی اصل تربیت عطا کرتی ہے۔ اس کے علاوہ اس مضمون کے مطالعے سے قاری زبان کی صوتی خوبصورتی کو محسوس کرتا ہے۔ آزاد کے جملوں میں صوتی تکرار، لفظی ہم آہنگی اور لسانی نغمگی ایسی ہے کہ قاری خود کو زبان کے بہاؤ میں محو پاتا ہے۔ اس بہاؤ سے پڑھنے والے کے اندر تلفظ کی درستی، رموز اوقاف کے صحیح استعمال، جملوں کے اتار چڑھاؤ اور معنی کے تسلسل کا شعور پیدا ہوتا ہے۔ یہی شعور بعد میں بولنے، لکھنے اور سننے کی صلاحیت کو بھی مضبوط بناتا ہے۔

ادبی اعتبار سے دیکھا جائے تو سچ اور جھوٹ کا رزم نامہ قاری کے اندر لسانی حس، اخلاقی شعور اور فکری گہرائی پیدا کرتا ہے۔

اسے پڑھنے والے پر یہ راز کھلتا ہے کہ زبان صرف اظہار نہیں بلکہ ایک ذمہ داری ہے کیونکہ لفظ سچ اور جھوٹ دونوں کے ترجمان بن سکتے ہیں۔ جب طلبہ اس پہلو کو سمجھنے لگتے ہیں تو ان کے اندر زبان کے صحیح اور درست استعمال کا شعور پیدا ہوتا ہے۔ وہ سیکھتے ہیں کہ تحریر کا لطف تب ہی حاصل ہوتا ہے جب قاری الفاظ کے سطحی معنی سے آگے بڑھ کر احساس اور منشا کو بھی سمجھ سکے۔ تعلیم و تدریس کے تناظر میں دیکھا جائے تو اس مضمون کے مطالعے سے طلبہ درج ذیل لسانی فوائد حاصل کر سکتے ہیں: درست تلفظ اور ادائیگی کی مشق، جملوں کے ربط اور معنی کے تسلسل کی پہچان، محاوراتی اور تمثیلی زبان کی فہم، زبان کے اخلاقی اور فکری پہلوؤں کا شعور اور سب سے بڑھ کر مطالعے کا ذوق جو کسی بھی زبان کی روح ہے۔ پڑھنے کی یہی مشق طلبہ کو زبان کے ساتھ ساتھ زندگی کی حقیقتوں سے بھی روشناس کرتی ہے۔ سچ اور جھوٹ کا رزم نامہ ایک ایسا آئینہ بن جاتا ہے جس میں قاری نہ صرف زبان کا حسن دیکھتا ہے بلکہ اپنی ذات اور معاشرے کے تضادات کو بھی پہچانتا ہے۔ یہ پہچان ہی وہ لمحہ ہے جہاں پڑھنے کا عمل فہم سے آگے شعور میں تبدیل ہو جاتا ہے۔ آخر میں کہا جا سکتا ہے کہ محمد حسین آزاد کا یہ مضمون اردو نثر کے فکری اور فنی حسن کا نادر نمونہ ہے۔ جو طالب علم اسے باریک بینی سے پڑھے گا وہ نہ صرف زبان کے ذوق سے بہرہ مند ہوگا ہے بلکہ اپنی ذہنی وسعت کو بھی فروغ دے گا۔ ایسا قاری پھر محض پڑھنے والا نہیں رہتا بلکہ زبان کا زندہ شعور رکھنے والا بن جاتا ہے۔ اور یہی وہ منزل ہے جہاں پڑھنے کی مہارت علم، اخلاق، اور جمال کا حسین امتزاج بن جاتی ہے۔

1.2.4 قواعد: صفت کی تعریف اور اقسام:

صفت: (Adjective) وہ کلمہ یا لفظ ہے جو کسی اسم کی حالت، کیفیت یا کمیت کو ظہار کرے۔ یعنی ہمیں صفت سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ کوئی چیز کیسی ہے، کتنی ہے یا کس حالت میں ہے۔ صفت ہمیشہ اسم کی وضات کرتی ہے اور اکثر اسم کے بعد یا کبھی پہلے آتی ہے۔ اگر صفت ہٹا دی جائے تو جملے کا مفہوم کم یا ادھورا رہ جاتا ہے۔ جیسے نیک لڑکا، خوبصورت پھول، محنتی طالب علم، چائے گرم ہے، دو لڑکیاں ہیں وغیرہ۔

صفت کی اقسام۔ بنیادی طور سے صفت کی پانچ اقسم ہیں۔

1۔ صفت ذاتی
2۔ صفت نسبتی
3۔ صفت عددی
4۔ صفت مقداری
5۔ صفت ضمیری/ اشاری

صفت ذاتی: وہ صفت ہے جس سے اسم کی اندرونی اور بیرونی حالت یا کیفیت ظاہر ہو۔ جیسے ہلکا، ٹھوس، گرم، ٹھنڈا، نرم، میٹھا، ہرا وغیرہ

صفت نسبتی: وہ صفت ہے جس میں کسی دوسری شے سے لگاؤ یا نسبت ظاہر ہو۔ جیسے بہاری، شہری، ہندوستانی، بستوی، عربی، مکی۔ مدنی، دکنی، مذہبی وغیرہ۔

صفت عددی: وہ صفت جس سے اسم کی تعداد معلوم ہو۔ جیسے چار کتابیں۔ دو لوگ۔ چھ طالب علم، تین قلم وغیرہ

صفت مقداری: وہ صفت جس سے کسی اسم کی مقدار کا تعین ہو۔ جیسے چار کلو گیہوں، ایک لیٹر دودھ، دو گز زمیں، پانچ میٹر کپڑا۔ دو درجن کیلا وغیرہ۔

صفت ضمیری: وہ ضمیریں جو صفت کا کام دیتے ہیں اور وہ یہ ہیں وہ، یہ کون، جو، کیا، ایسا، اس، انہیں وغیرہ۔ مثلاً یہ کتاب اچھی ہے۔ وہ لڑکا ذہین ہے۔ اس پھول کی خوشبو تیز ہے۔ ان لوگوں کا رویّہ بہتر ہے۔ وغیرہ۔ واضح رہے کہ یہ تمام الفاظ اسم کی طرف اشارہ کر کے اس کی وضاحت کر رہے ہیں، اس لیے یہ صفت ضمیری ہیں۔

محمد حسین آزاد کا مضمون سچ اور جھوٹ کا رزم نامہ طلبہ کے لیے صفت اور اس کی اقسام کو سمجھنے کے لیے اہم ہے کیونکہ اس میں مختلف جملوں

میں صفت کا عملی استعمال دکھایا گیا ہے۔طلبہ یہاں دیکھ سکتے ہیں کہ کسی چیز کی حالت، کیفیت یا مقدار کو کس طرح بیان کیا جاتا ہے اور ہر صفت کا اثر جملے کی معنویت پر کیسے ہوتا ہے۔اس طرح طلبہ صرف تعریفیں یاد نہیں کرتے بلکہ عملی مثالوں کے ذریعے قواعد کا شعوری ادراک حاصل کرتے ہیں۔متن سے چند مثالیں درج کی جاتی ہیں۔

صفت ذاتی:

ذرا سختی، تلخی، اصلی نور ، سیاہی

کمیٹی میں یہ بات کھلی کہ ملکہ کی طبیعت میں ذرا سختی ہے اور کارروائی میں تلخی ہے

پھر اپنا اصلی نور پھیلاتا ہے

جھوٹ اپنی سیاہی کو ایسا رنگ آمیزی کر کے پھیلاتا ہے

صفت نسبتی:

انسانی ، سلطانی

مگر جب بار بار ایسے پاجی کمینے کو اپنے مقابلہ پر دیکھتی تھی اور اس میں سوا مکر و فریب اور کمزوری و بے ہمتی کے اصالت اور شجاعت کا نام نہ پاتی تھی۔

پہلے جھوٹ سے کچھ زرق برق کے کپڑے مانگ تانگ کر لاتا ہے

صفت عددی:

تین باتیں ، دوامر تنقیح طلب

عہد قدیم کے مؤرخ لکھتے ہیں کہ اگلے زمانہ میں فارس کے شرفا اپنے بچوں کے لیے تین باتوں کی تعلیم میں بڑی کوشش کرتے تھے

اسی وقت عالم بالا کے پاک نہادوں کو جمع کر کے ایک انجمن منعقد کی۔اس میں دو امر تنقیح طلب قرار پائے

صفت مقداری:

ہزاروں رسالے ، چند روزہ عمر ، ایک سڑک

دنیا کی ہوا و ہوس، ہزاروں رسالے اور پلٹنیں اس کے ساتھ لیے تھیں اور چونکہ یہ ان کی مدد کا محتاج تھا

چند روزہ عمر میں بہت سی باتیں پیش آتی ہیں، جو اس مشت خاک کو اس دیو آتش زاد کی اطاعت کے لیے مجبور کرتی ہیں

اس لیے دھوکہ بازی اور شبہ کاری کو حکم دیا کہ ہمارے چلنے پھرنے کے لیے ایک سڑک تیار کرو

صفت ضمیری/ اشارتی

یہ ، وہ ، اس

ابھی بھی یہ جامہ پہن کر لوگوں کو جل دیا کرتا تھا

جب تبدیل لباس کر کے وہاں جا پہنچتا ہے تو وہ لفافہ اتار کر پھینک دیتا ہے

اب یہی وقت آ گیا ہے، یعنی جھوٹ اپنی سیاہی کو ایسا رنگ آمیزی کر کے پھیلاتا ہے کہ سچ کی روشنی کو لوگ اپنی آنکھوں کے لیے مضر سمجھنے لگے ہیں۔

سچ اور جھوٹ کا رزم نامہ طلبہ کے لیے صفت اور اس کی اقسام کو سمجھنے کے اعتبار سے اس لیے اہم ہے کہ اس میں کرداروں، افعال اور حالات کی وضاحت مؤثر صفات کے ذریعے کی گئی ہے، جس سے طلبہ یہ سیکھتے ہیں کہ صفت کس طرح اسم کی کیفیت، حالت اور پہچان واضح کرتی ہے۔اس متن کے ذریعے ذاتی، وصفی اور نسبتی صفات کی عملی اور بامعنی مثالیں سامنے آتی ہیں اور یہ بات واضح ہوتی ہے کہ صفت محض ایک قاعدہ نہیں بلکہ معنی میں وسعت، تاثیر اور وضاحت پیدا کرنے کا اہم ذریعہ ہے، جس سے زبان فہم اور اظہار دونوں مضبوط

ہوتے ہیں۔

خود اکتسابی کے لیے سوالات II

صحیح یا غلط کی نشان دہی کیجیے۔

1۔ پڑھنے کے عمل میں قاری محض الفاظ کو دہراتا ہے، معنی سے کوئی سروکار نہیں ہوتا۔ صحیح/غلط

2۔ پڑھنے کی مہارت قاری کو صرف الفاظ کی پہچان تک محدود رکھتی ہے۔ صحیح/غلط

3۔ تلفظ کی درستی اور رموزِ اوقاف کا صحیح استعمال پڑھنے کی مشق سے بہتر ہوتا ہے۔ صحیح/غلط

4۔ صفت وہ لفظ ہے جو فعل کی وضاحت کرتا ہے۔ صحیح/غلط

5 خوبصورت پھول میں خوبصورت صفت ہے۔ صحیح/غلط

6۔ بہاری، مدنی، عربی صفت عددی کی مثالیں ہیں۔ صحیح/غلط

7۔ چار کلو گیہوں صفت مقداری کی مثال ہے۔ صحیح/غلط

8۔ سچ اور جھوٹ کا رزم نامہ میں صرف اخلاقی سبق دیا گیا ہے، اس میں زبان کا کوئی پہلو نہیں۔ صحیح/غلط

9۔ پڑھنے کی مہارت بولنے اور لکھنے کی صلاحیت کو بھی مضبوط بناتی ہے۔ صحیح/غلط

10۔ دکنی شاعر میں دکنی صفت نسبتی ہے۔ صحیح/غلط

11۔ سچ اور جھوٹ کا رزم نامہ میں تمثیل کے ذریعے انسانی فطرت کو بیان کیا گیا ہے۔ صحیح/غلط

12۔ پڑھنا زبان سیکھنے کی تیسری بنیادی مہارت ہے۔ صحیح/غلط

13۔ نرم دل آدمی میں نرم دل ''صفت ذاتی ہے۔ صحیح/غلط

1.3 الفاظ اور معنی

الفاظ	معنی
لطیف	نازک، نرم
وسیلہ	ذریعہ، واسطہ
تفہیم	سمجھانا
احساس	جذبہ، شعور
بصیرت	گہری سمجھ
ہم آہنگی	میل، توافق
تمثیل	علامتی کہانی
تلمیح	اشارہ کسی تاریخی واقعے یا شخصیت کی طرف
تشبیہ	مماثلت، مشابہت
کشمکش	ٹکراؤ، مقابلہ
منشا	ارادہ، مقصد
ذوق	شوق، رغبت
فہم	سمجھ

شعور	ادراک، آگاہی
امتزاج	ملاپ، آمیزش
کیفیت	حالت، صورت
مؤرخ	تاریخ لکھنے والا
راست بازی	سچائی، دیانت
دروغ	جھوٹ
استقلال	ثابت قدمی
نمود	دکھاوا
نابکار	بدذات، کمینہ
سوانگ	نقل، اداکاری
کوتاہ اندیش	کم عقل، محدود سوچ والا
دوراندیشی	آگے کی سوچ
فارغ البالی	بےفکری
زرق برق	چمکدار، شوخ رنگ
قلعی کھلنا	حقیقت ظاہر ہونا
استعداد	صلاحیت
مضر	نقصان دہ

1.4 خوداکتسابی سوالات کے جوابات

I

1۔ 1830
2۔ شہید
3۔ 1880
4۔ جانسن
5۔ ملکہ صداقت۔ دروغ دیوزاد
6۔ تمثیلی
7۔ آب حیات
8۔ اردو افسانہ
9۔ سچائی
10۔ آغا محمد طاہر
11۔ محمد حسین آزاد
12۔ لاہور

13۔ دروغ دیوزاد

II

1۔ غلط
2۔ غلط
3۔ صحیح
4۔ غلط
5۔ صحیح
6۔ غلط
7۔ صحیح
8۔ غلط
9۔ صحیح
10۔ صحیح
11۔ صحیح
12۔ صحیح
13 صحیح

1.5 خلاصہ

اکائی دوم بعنوان سچ اور جھوٹ کا رزم نامہ محمد حسین آزاد کے مشہور تمثیلی مضمون پر مبنی ہے۔اس اکائی کا مقصد طلبہ کو اردو نثر کے فکری، اخلاقی اور لسانی حسن سے روشناس کرانا ہے۔اس میں پڑھنے اور سمجھنے کی مہارت پر خاص زور دیا گیا ہے تا کہ طلبہ اردو نثر کی ساخت، جملوں کے ربط اور معنوی پہلوؤں کو بہتر طور پر سمجھ سکیں۔محمد حسین آزاد اردو نثر کے ممتاز انشا پرداز، مصلح اور مؤرخ تھے۔وہ اپنے زمانے کے ان چند ادیبوں میں شامل ہیں جنہوں نے نثر کو فکری گہرائی، ادبی حسن اور اخلاقی مقصدیت عطا کی۔سچ اور جھوٹ کا رزم نامہ ان کی انہی خصوصیات کی عکاس ایک تمثیلی نثر ہے، جس میں انہوں نے سچ اور جھوٹ کے درمیان ہونے والی جنگ کو علامتی انداز میں پیش کیا ہے۔

مضمون کا مرکزی خیال یہ ہے کہ انسان کی زندگی میں سچائی اور جھوٹ دو ایسی متضاد قوتیں ہیں جو ہمیشہ ایک دوسرے سے برسر پیکار رہتی ہیں۔سچائی انسانی ضمیر، ایمان اور اخلاق کی نمائندہ ہے جبکہ جھوٹ فریب، خودغرضی اور بددیانتی کی علامت ہے۔آزاد نے اس معرکے کو ایک جنگ کی صورت میں دکھایا ہے تا کہ قاری آسانی سے سمجھ سکے کہ انسانی کردار کی اصل کشمکش کس طرح سچ اور جھوٹ کے درمیان چلتی رہتی ہے۔تحریر میں زبان کی سادگی کے ساتھ فکری گہرائی بھی موجود ہے۔آزاد نے تمثیل، تشبیہ اور استعارے کے ذریعے مشکل خیالات کو دلچسپ پیرایے میں بیان کیا ہے۔ان کی نثر میں ایک خاص قسم کی نرمی، روانی اور موسیقیت پائی جاتی ہے جو قاری کو نہ صرف محظوظ کرتی ہے بلکہ سوچنے پر بھی مجبور کرتی ہے۔مذکورہ مضمون میں طنز اور مزاح کی جھلک بھی ملتی ہے، مگر اس کے پیچھے گہرا اخلاقی پیغام چھپا ہوا ہے کہ سچ کبھی مٹ نہیں سکتا، جھوٹ وقتی طور پر غالب آئے تو بھی انجام کار شکست اس کا مقدر ہے۔

تدریسی اعتبار سے یہ اکائی نہ صرف زبان و بیان کی عمدگی کا نمونہ ہے بلکہ اخلاقی تربیت کے لحاظ سے بھی اہم ہے۔اس سے طلبہ کو یہ سبق ملتا ہے کہ سچ بولنا، سچ پر قائم رہنا اور سچائی کے ساتھ جینا انسان کی اصل شناخت ہے۔اس اکائی میں مختلف ادبی اصطلاحات جیسے تمثیل، تلمیح، تشبیہ، استعارہ، صوتی تکرار وغیرہ کی عملی مثالیں ملتی ہیں، جو نثر کے فنی پہلو کو سمجھنے میں مدد دیتی ہیں۔اکائی کے آخر میں مشکل الفاظ کے

معنی درج ہیں تا کہ طلبہ اپنی لغوی استعداد بہتر بنا سکیں۔اس کے علاوہ خود اکتسابی کے سوالات بھی درج کیے گئے ہیں تا کہ طلبہ خود جانچ کر سکیں۔مجموعی طور پر سچ اور جھوٹ کا رزم نامہ ایک ایسی تمثیلی تحریر ہے جو زبان کی خوبصورتی کے ساتھ سچائی کی قوت، انسانی ضمیر کی صداقت اور جھوٹ کی وقتی چمک دمک کو نہایت دلکش انداز میں پیش کرتی ہے۔آزاد کا یہ پیغام آج بھی تازہ ہے کہ سچائی ہی انسان کی اصل طاقت ہے اور جھوٹ خواہ کتنی ہی تدبیریں اختیار کرے آخر کار سچ کے نور میں گم ہو جاتا ہے۔

1.6 خود اکتسابی کے لیے مشق

تحریری سرگرمیاں:

دیے گئے اقتباس میں اسم، ضمیر، صفت، فعل، فاعل، مفعول، محاورے اور روزمرہ کی شناخت کیجیے۔

اس میں شک نہیں کہ دنیا بری جگہ ہے۔چند روزہ عمر میں بہت سی باتیں پیش آتی ہیں جو اس مشت خاک کو اس دیو آتش زاد کی اطاعت کے لئے مجبور کرتی ہیں۔انسان سے اکثر ایسا جرم ہو جاتا ہے کہ اگر قبولے تو مرنا پڑتا ہے، ناچار مکرنا پڑتا ہے، کبھی ابلہ فریبی کر کے جاہلوں کو پھنساتا ہے۔جب لقمہ رزق کا پاتا ہے۔اس کے علاوہ بہت مزے دنیا کے ہیں کہ مکر و دغا ان کی چاٹ لگاتی ہے اور جزوی جزوی خطائیں ہو جاتی ہیں جن سے مکرتے ہی بن آتی ہے۔غرض بہت کم انسان ہوں گے جن میں یہ حوصلہ و استقلال ہو کہ راستی کے راستے میں ہر دم ثابت قدم ہی رہیں۔

یہ بھی یاد رہے کہ انسان کے سچ بولنے کے لئے سننے والے بھی ضرور ہیں، کیوں کہ خوشامد جس کی دکان میں آج موتی برس رہے ہیں اس سے زیادہ جھوٹ کیا ہوگا اور کون ایسا ہے جو اس کی قید کا زنجیر نہیں۔ڈرپوک بے چارا اڈر کا مارا خوشامد کرتا ہے۔تابع دار امید کا بھوکا آقا کو خوش کر کے پیٹ بھرتا ہے۔دوست محبت کا بندہ ہے۔اپنے دوست کے دل میں اسی سے گھر کرتا ہے۔بہت ایسے بھی ہیں کہ نہ غلام ہیں، نہ ڈرپوک ہیں انہیں باتوں باتوں میں خوش کر دینے ہی کا شوق ہے۔اسی طرح جب جلسوں میں نمودیے گدھوں کے دعوے بل ڈاگ کی آواز سے کئی میدان آگے نکل جاتے ہیں، تو ان میں وہ لوگ بھی ہوتے ہیں جنہیں کچھ امید، کچھ ڈر، کچھ مروت سے غرض چار و ناچار، کبھی ان کے ساتھ، کبھی پیچھے پیچھے دوڑنا پڑتا ہے۔

کام کا تجربہ:

دیے گئے جملوں کا انگریزی میں ترجمہ کریں۔

1۔ علی نے اپنا کام وقت پر مکمل کیا۔
2۔ آج موسم بہت خوشگوار ہے۔
3۔ میں کل تم سے ملنے آؤں گا۔
4۔ استاد نے ہمیں ایک نیا سبق پڑھایا۔
5۔ کیا تم نے نیا سبق یاد کر لیا؟
6۔ جب میں پہنچا تو وہ جا چکا تھا۔
7۔ آج بہت گرمی ہے۔
8۔ دروازہ بند کر دو۔
9۔ ہمیں بڑوں کی عزت کرنی چاہیے۔
10۔ ہمیں اپنے ملک پر فخر ہے۔

11۔ لال قلعہ دہلی میں ہے۔
12۔ میں کل تم سے ملنے آونگا۔
13۔ اردو ایک ہندوستانی زبان ہے۔
14۔ کیا تم نے اپنا کام مکمل کیا؟
15۔ اس نے کہا کہ وہ واپس آئے گا۔
16۔ وہ ہمیشہ وقت پر آتا ہے۔
17۔ والدہ نے بہت اچھا مشورہ دیا۔

1.6 مشقی سوالات

1۔ محمد حسین آزاد کے سوانحی حالات بیان کیجیے۔؟
2۔ تمثیل کے بارے میں اپنی معلومات تحریر کیجیے۔؟
3۔ سچ اور جھوٹ کا رزنامہ کا فنی تجزیہ کیجیے۔؟
4۔ زبان کی مہارتوں میں سے پڑھنے کی اہمیت پر روشنی ڈالیے۔؟
5۔ سچ اور جھوٹ کا رزنامہ کے پڑھنے کی اہمیت بیان کیجیے۔؟
6۔ صفت کی تعریف مع امثال تحریر کیجیے۔؟
7۔ صفت کی اقسام پر تفصیلی روشنی ڈالیے۔؟

1.7 مزید مطالعے کے لیے کتب

1۔ اردو نحو و صرف، مولوی عبدالحق، انجمن ترقی اردو ہند 1967
2۔ انشائیہ کے خدوخال، وزیر آغا، انجمن ترقی اردو ہند دہلی 1991
3۔ اردو املا، رشید حسن خاں، نیشنل اکیدمی دہلی 1974
4۔ نیرنگ خیال، مکتبہ جامعہ دہلی 1970
5۔ مونوگراف محمد حسین آزاد، عتیق اللہ، اردو اکیدمی دہلی 2008

اکائی 3: جھینگر کا جنازہ، خواجہ حسن نظامی

ساخت

3.0 مقاصد

3.1 تمہید

3.2 موضوع کی وضاحت

3.2.1 متن: جھینگر کا جنازہ

3.2.2 جھینگر کا جنازہ کا فنی تجزیہ

خود اکتسابی کے لیے سوالات I

3.2.3 **زبان کی مہارتیں:** جھینگر کا جنازہ کی اہمیت زبان کی مہارت لکھنا کے حوالے سے

3.2.4 **قواعد:** فعل و فاعل

خود اکتسابی کے لیے سوالات II

3.3 الفاظ اور معنی

3.4 خود اکتسابی سوالات کے جوابات I

خود اکتسابی سوالات کے جوابات II

3.5 خلاصہ

3.6 خود اکتسابی کے لیے مشق

تحریری سرگرمیاں: قواعد کی شناخت

کام کا تجربہ: ترجمے کی مشق

3.7 مشقی سوالات

3.8 مزید مطالعے کے لیے کتب

3.0 مقاصد

اس اکائی کے مطالعہ کے بعد طلبا سے توقع کی جاتی ہے کہ وہ.....

- ☆ خواجہ حسن نظامی کے سوانحی حالات سے واقف ہوں گے۔
- ☆ خواجہ حسن نظامی کی علمی و ادبی خدمات کو جان سکیں گے۔
- ☆ جھینگر کا جنازہ کے بنیادی خیالات کو سمجھ سکیں گے۔
- ☆ خواجہ حسن نظامی کی مضمون نگاری کی انفرادیت سے واقفیت حاصل کریں گے۔
- ☆ جھینگر کا جنازہ کا فنی تجزیہ کر سکیں گے۔
- ☆ زبان کی مہارتوں میں سے لکھنا کی اہمیت جان سکیں گے۔
- ☆ جھینگر کا جنازہ کے حوالے سے لکھنے کی اہمیت کو سمجھ سکیں گے۔
- ☆ فعل و فاعل کی تعریف اور اقسام سے واقف ہو سکیں گے۔

3.1 تمہید

اکائی سوم کا عنوان ''جھینگر کا جنازہ'' ہے، جو اردو کے ممتاز نثر نگار، صحافی اور مزاح نگار خواجہ حسن نظامی کی ایک دل چسپ اور سبق آموز تحریر ہے۔ خواجہ حسن نظامی اردو نثر میں انشا پردازی، مزاح اور اصلاحی جذبے کے حسین امتزاج کے لیے جانے جاتے ہیں۔ ان کی تحریریں نہ صرف ادبی حسن رکھتی ہیں بلکہ قاری کو سماجی شعور اور انسانی ہمدردی کا احساس بھی عطا کرتی ہیں۔ اس اکائی میں خواجہ حسن نظامی کی زندگی، ادبی خدمات اور اسلوبِ تحریر کا مختصر تعارف پیش کیا گیا ہے تاکہ طلبہ ان کی شخصیت اور ان کے عہد کے ادبی و تہذیبی پس منظر سے واقف ہو سکیں۔ اس کے بعد ان کے معروف مزاحیہ مضمون "جھینگر کا جنازہ" کا مطالعہ کیا جائے گا، جو بظاہر ایک ہلکی پھلکی کہانی معلوم ہوتی ہے، لیکن اس کے پس منظر میں انسانی رویّوں، معاشرتی تضادات اور اخلاقی طنز کا گہرا پیغام پوشیدہ ہے۔ مضمون کے فنی تجزیے کے ذریعے طلبہ اس کی بیانیہ ساخت، مزاح کے اسلوب، زبان کی سادگی و شگفتگی اور نثر کے فکری و جذباتی پہلوؤں کو سمجھنے کی کوشش کریں گے۔ اس اکائی میں زبان کی چار بنیادی مہارتوں میں سے خاص طور پر لکھنے کی مہارت پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ طلبہ کو مضمون کے مطالعے اور تجزیے کے بعد خود اپنی تحریری صلاحیت کو بروئے کار لانے کا موقع دیا جائے گا تاکہ وہ اظہارِ خیال میں روانی اور درستگی پیدا کر سکیں۔

قواعد کے حصے میں فعل اور فاعل کی تعریف اور اقسام مثالوں کے ذریعے وضاحت کی جائے گی، تاکہ طلبہ جملے کی ساخت اور معنیاتی ربط کو بہتر طور پر سمجھ سکیں۔ اس کے علاوہ الفاظ و معنی، خود اکتسابی کے سوالات، انگریزی سے اردو ترجمے کی مشقیں بھی شامل ہیں، جن کے ذریعے طلبہ دو زبانوں میں معنوی اور لسانی مہارت پیدا کریں گے۔ اس کے علاوہ چند منتخب جملوں کی مدد سے قواعد کی عملی شناخت (اسم، صفت، فعل، فاعل، مفعول، محاورے اور روزمرہ) کی مشق بھی کروائی جائے گی۔ یہ تمام سرگرمیاں طلبہ کی ادبی فہم، لسانی مہارت اور تحریری صلاحیت کو فروغ دینے کے لیے ترتیب دی گئی ہیں، تاکہ وہ نہ صرف نثری ادب کی لطافتوں کو محسوس کریں بلکہ زبان کے عملی استعمال میں بھی اعتماد پیدا کر سکیں۔ یہ اکائی طلبہ کو مزاحیہ نثر کے فنی حسن سے روشناس کراتے ہوئے زبان، قواعد اور اظہار کے میدان میں پختگی عطا کرے گی۔

خواجہ حسن نظامی کے سوانحی حالات:

خواجہ حسن نظامی (1879–1955) اردو ادب کی ان ہمہ جہت شخصیات میں سے ہیں جنہوں نے اپنی تحریروں، فکری بصیرت اور روحانی وابستگی سے اردو نثر کو ایک نئی سمت عطا کی۔ ان کا اصل نام سید علی حسن تھا۔ وہ دہلی میں بستی حضرت نظام الدین اولیاء میں پیدا ہوئے، جہاں کے روحانی ماحول نے ان کے مزاج اور فکر پر گہرا اثر ڈالا۔ ان کے والد حافظ سید عاشق علی نظامی جلد سازی کر کے گھر کے اخراجات سنبھالتے تھے۔ بچپن میں خواجہ حسن نظامی نے غربت اور تنگ دستی کے کئی مرحلے دیکھے، لیکن انہی حالات نے ان کی شخصیت کو خوددار، محنتی اور حساس بنا دیا۔ ابتدائی تعلیم بستی حضرت نظام الدین میں حاصل کرنے کے بعد انہوں نے مولانا رشید الدین گنگوہی کے مدرسہ سے فراغت پائی اور اپنے عہد کے ممتاز علما سے بھی اکتسابِ علم کیا۔ نوجوانی میں وہ کتابوں اور دہلی کی تاریخی عمارتوں کی تصویریں بیچا کرتے تھے اور درگاہ پر آنے والے زائرین کے جوتوں کی حفاظت کر کے گھر کے اخراجات میں مدد دیتے تھے۔

خواجہ حسن نظامی نے اردو ادب کو کئی جہتوں سے مالا مال کیا۔ وہ ادیب، مورخ، صحافی، مصلح اور صاحب طرز انشا پرداز تھے۔ انہوں نے اردو روزنامچے کو ایک باقاعدہ صنف کی حیثیت دی اور قلمی چہرے کا سلسلہ شروع کیا۔ ان کی ادارت میں متعدد اخبارات و رسائل شائع ہوئے جن میں منادی کو غیر معمولی شہرت حاصل ہوئی۔ ان کی تصانیف کی تعداد درجنوں شمار ہے۔ نمایاں کتابوں میں بیگمات کے آنسو، غدر کی صبح و شام، فلسفہ شہادت، گاندھی نامہ، یزید نامہ، آپ بیتی اور کرشن بیتی وغیرہ شامل ہیں۔ ہندو تہذیب و ثقافت پر گہری نظر تھی۔ وہ گنگا جمنی تہذیب کے بڑے علمبردار تھے۔ انہوں نے ہندو تیرتھوں کا سفر سادھو کے لباس میں کیا اور اس تجربے کو تیرتھ یاترا کے

نام سے قلم بند کیا۔خواجہ حسن نظامی کو مصور فطرت کے لقب سے بھی یاد کیا جاتا ہے۔ان کے انشائیے زندگی،فطرت اور انسانی رویوں کی دل آویز تصویریں پیش کرتے ہیں۔نصاب میں شامل ان مضمون جھینگر کا جنازہ ان کا مشہور انشائیہ ہے۔اس کے علاوہ ان کے مشہور انشائیوں میں مرغ کی اذان، مچھر، مکھی، الو، گلاب تمہارا، کیکر ہمارا وغیرہ شامل ہیں۔1955 میں وہ اس دار فانی سے رخصت ہوئے اور بستی حضرت نظام الدین اولیاء دہلی میں سپرد خاک ہوئے۔ان کی نثر میں روحانیت، مزاح، مشاہدہ اور زبان کی فطری روانی کا حسین امتزاج ملتا ہے۔ان کی تحریریں آج بھی اردو نثر کے ذوق، اسلوب اور تہذیبی شعور کی زندہ مثال ہیں۔

3.2 موضوع کی وضاحت

3.2.1 متن: جھینگر کا جنازہ

میری سب کتابوں کو چاٹ گیا۔ بڑا موزی تھا۔خدا نے پردہ ڈھک لیا۔افوہ جب اس کی لمبی لمبی دو مونچھوں کا خیال کرتا ہوں، جو وہ مجھکو دکھا کر ہلایا کرتا تھا تو آج اس کی لاش دیکھ کر بہت خوشی ہوتی ہے۔بھلا دیکھ تو قیصر ولیم کی نقل اتارتا تھا۔

اس جھینگر کی داستان ہرگزہ کہتا، اگر دل سے یہ عہد نہ کیا ہوتا کہ دنیا میں جتنے حقیر و ذلیل مشہور ہیں، میں ان کو چار چاند لگا کر چمکاؤں گا۔

ایک دن اس مرحوم کو میں نے دیکھا کہ حضرت ابن عربی کی فتوحات مکیہ کی ایک جلد میں چھپا بیٹھا ہے۔میں نے کہا کیوں رے شریر تو یہاں کیوں آیا؟ اچھل کر بولا ذرا اس کا مطالعہ کرتا تھا۔سبحان اللہ۔تم کیا خاک مطالعہ کرتے تھے، بھائی یہ تو ہم انسانوں کا حصہ ہے۔ بولا واہ۔قرآن نے گدھے کی مثال دی ہے کہ لوگ کتاب میں پڑھ لیتے ہیں مگر نہ ان کو سمجھتے ہیں اور نہ ان پر عمل کرتے ہیں۔لہذا وہ بوجھ اٹھانے والے گدھے ہیں جن پر علم و فضل کی کتابوں کا بوجھ لدا ہوا ہے۔

مگر میں نے اس مثال کی تقلید نہیں کی۔خدا مثال دینی جانتا ہے۔تو بندہ بھی اس کی دی ہوئی طاقت سے ایک نئی شان پیدا کر سکتا ہے اور وہ یہ ہے کہ انسان مثل ایک جھینگر کے ہے جو کتابیں چاٹ لیتے ہیں سمجھتے بوجھتے خاک نہیں۔

یہ جتنی یونیورسٹیاں ہیں سب میں یہی ہوتا ہے۔ایک شخص بھی ایسا نہیں ملتا جس نے علم کو علم سمجھ کر پڑھا ہو۔جھینگر کی یہ بات سن کر مجھ کو غصہ آیا اور میں نے زور سے کتاب پر ہاتھ مارا جھینگر پھدک کر دوسری کتاب پر جا بیٹھا اور قہقہا مار کر ہنسنے لگا۔واہ خفا ہو گئے۔بگڑ گئے۔لاجواب ہو کر لوگ ایسا ہی کیا کرتے ہیں۔

لیاقت تو یہ تھی کچھ جواب دیتے۔لگے ناراض ہونے اور دھتکارنے۔

ہائے کل تو یہ تماشا دیکھا تھا، آج غسل خانہ میں وضو کرنے گیا تو دیکھا بیچارے جھینگر کی لاش کالی چیونٹیوں کے ہاتھوں پر رکھی ہے اور وہ اس کو دیوار پر کھینچے لیے چلی جاتی ہیں۔

جمعہ کا وقت قریب تھا۔خطبہ کی اذان پکار رہی تھی۔دل نے کہا جمعے تو ہزاروں آئیں گے خدا سلامتی دے نماز پھر پڑھ لنا۔اس جھینگر کے جنازے کو کندھا دینا ضروری ہے۔یہ موقعے بار بار نہیں آتے۔

بے چارہ غریب تھا، خلوت نشین تھا۔ خلقت میں حقیر و ذلیل تھا۔مکروہ تھا۔غلیظ سمجھا جاتا تھا۔اسی کا ساتھ نہ دیا تو کیا امریکہ کے کروڑ پتی راک فیلر کے شریک ماتم ہوگے۔

اگر چہ اس جھینگر نے ستایا تھا۔جی دکھایا تھا لیکن حدیث میں آیا ہے کہ مرنے کے بعد لوگوں کا اچھے الفاظ میں ذکر کیا کرو۔اس واسطے میں کہتا ہوں

خدا بخشے بہت سی خوبیوں کا جانور تھا۔ہمیشہ دنیا کے جھگڑوں سے الگ کونے میں، کسی سوراخ میں، بوریے کے نیچے، آبخورے کے اندر چھپا بیٹھا رہتا تھا۔

نہ بچھو کا سا زہریلا ٹک تھا، نہ سانپ کا ڈسنے والا پھن۔نہ کوئی سی شریر چونچ تھی، نہ بلبل کی مانند پھول کی عشق بازی۔شام کے وقت

عبادت رب کے لیے ایک مسلسل بین بجاتا تھا اور کہتا تھا کہ یہ غافلوں کے لیے صور ہے اور عاقلوں کے واسطے جلوہ طور ہے۔
ہائے آج غریب مر گیا۔ جی سے گزر گیا۔ اب کون جھینکر کہلائے گا۔ اب ایسا مونچھوں والا کہاں دیکھنے میں آئے گا۔ ولیم میدان جنگ میں ہے ورنہ اس کو دو گھڑی پاس بٹھا کر جی بہلاتے کہ مری مٹی کی نشانی ایک یہی بیچارہ دنیا میں باقی رہ گیا ہے۔
ہاں تو ''جھنگر کا جنازہ ہے ذرا دھوم سے نکلے'' چیونٹیاں تو اس کو اپنے پیٹ کی قبر میں دفن کر دیں گی۔ میرا خیال تھا کہ ان شکم پرستوں سے اس توکل شعار فاقہ مست کو بچا تا ''ویسٹ منسٹر ایبے'' یا قادیان کے بہشتی مقبرے میں دفن کراتا۔ مگر جناب یہ کالی چیونٹیاں بھی افریقہ کے مردم خوار سیاہ وحشیوں سے کم نہیں۔ کالی جو چیز بھی ہو ایک بلائے بیدرماں ہے۔ اس سے چھٹکارا کہاں ہے۔
خیر تو مرثیے کے دو لفظ کہہ کر مرحوم سے رخصت ہو۔
جھینگر کا جنازہ ہے ذرا دھوم سے نکلے
قیصر کا پیارا ہے اسے توپ پر کھینچو!
اے پروفیسر! اے فلاسفر!! اے متوکل درویش!!! اے نغمہ ربانی گانے والے قوال۔ ہم تیرے غم میں نڈھال ہیں اور توپ کی گاڑی پر تیری لاش اٹھانیکا اور اپنے بازو پر کالا نشان باندھنے کا ریزولیوشن پاس کرتے ہیں۔ خیر اب تو چیونٹی کے پیٹ کی قبر میں دفن ہو جا۔ مگر ہم ریزولیوشنوں میں تجھے یاد رکھیں گے۔

3.2.2 جھینگر کا جنازہ کا فنی تجزیہ

خواجہ حسن نظامی اردو ادب کے ان ممتاز انشا پردازوں میں شمار ہوتے ہیں جنہوں نے نثر میں سادگی، شگفتگی اور فکری گہرائی کا حسین امتزاج پیدا کیا۔ وہ ایک طرف چشتی صوفی سلسلے کے بزرگ اور صاحب حال درویش تھے تو دوسری طرف ایک نکتہ رس، طنز و مزاح کے دل دادہ اور تخلیقی شعور رکھنے والے ادیب بھی۔ ان کی نثر میں تصوف کی لطافت، دلی کے روزمرہ کی چاشنی مل کر ایک ایسا اسلوب تشکیل دیتے ہیں جو بیک وقت دل کو بھی چھوتا ہے اور دماغ کو بھی جھنجھوڑتا ہے۔ ان کا انشائیہ جھینگر کا جنازہ انہی خصوصیات کا بھرپور مظہر ہے، جو ان کے مجموعے سی پارہ دل میں شامل ہے۔ بظاہر یہ ایک معمولی کیڑے کی موت پر طنزیہ و مزاحیہ انداز میں لکھا گیا مضمون معلوم ہوتا ہے لیکن اس کے پس منظر میں انسانی علم، اخلاق، معاشرت اور خود شناسی پر نہایت گہرا تبصرہ پوشیدہ ہے۔
انشائیے کا مرکزی کردار ایک جھینگر ہے جو اپنی زندگی میں مصنف کو ستاتا بھی ہے اور چڑھاتا بھی مگر مرنے کے بعد وہی جھینگر انسان کی کمزوریوں اور معاشرتی تضادات کا آئینہ بن جاتا ہے۔ خواجہ حسن نظامی نے اس معمولی جاندار کے مرنے کے واقعے کو ایک تمثیل کے طور پر پیش کیا ہے جس کے ذریعے وہ اس علم پر طنز کرتے ہیں جو عمل سے خالی ہے۔ جھینگر کی زبان سے وہ بات کہلواتے ہیں کہ انسان مثل ایک جھینگر کے ہے جو کتابیں چاٹ لیتے ہیں سمجھتے بوجھتے خاک نہیں اور یہی جملہ اس انشائیے کا مرکزی نکتہ بن جاتا ہے۔ یہ طنز نہ صرف اس دور کے تعلیم یافتہ طبقے پر چوٹ ہے بلکہ آج کے دور میں بھی اتنا ہی بامعنی اور تازہ محسوس ہوتا ہے۔ خواجہ صاحب کا اصل کمال یہی ہے کہ وہ معمولی واقعے میں عالم انسانی کے بڑے مسائل کو سمو دیتے ہیں۔
انشائیے کا اسلوب ان کی نثر کی طرح سادہ، شگفتہ اور محاوراتی ہے۔ ان کے جملے چھوٹے، رواں اور برجستہ ہیں۔ دہلی کے شہری لہجے اور ٹکسالی روزمرہ نے عبارت کو ایک فطری روانی دی ہے۔ خدا بخشے بہت سی خوبیوں کا جانور تھا یا یہ کالی چیونٹیاں بھی افریقہ کے مردم خوار سیاہ وحشیوں سے کم نہیں جیسے جملے نہ صرف زبان کی چمک دکھاتے ہیں بلکہ خواجہ صاحب کے فنی شعور کی بلندی اور طنز کی نرمی کو بھی ظاہر کرتے ہیں۔ وہ قاری کو ہنساتے ہیں مگر اس ہنسی کے پردے میں سوچنے پر مجبور کر دیتے ہیں۔ یہی ان کے فن کی اصل خوبی ہے۔
خواجہ حسن نظامی نے تشبیہ، استعارہ، تضاد اور ایجاز کے فنی حربوں کو نہایت مہارت سے برتا ہے۔ کہیں جھینگر کے جنازے کی منظر کشی ہے، کہیں چیونٹیوں کے ہاتھوں اس کی تدفین کا منظر اور کہیں مصنف کے دل کی کیفیت کہ وہ جمعے کی نماز چھوڑ کر جھینگر کے جنازے کو کندھا دینے کی بات کرتا ہے۔ ان تمام مناظر میں ایک طرف ظرافت کا رنگ ہے تو دوسری طرف ایک درویشانہ درد اور سچائی کی جستجو بھی چھپی

ہے۔خواجہ صاحب کا قلم مذاق کے دائرے میں رہ کر بھی وعظ کا کام دیتا ہے، لیکن ایسا وعظ جو مصنوعی نہیں بلکہ تجربے اور بصیرت سے پیدا ہوا ہو۔ یہ انشائیہ اگر چہ طنزیہ اور مزاحیہ رنگ رکھتا ہے مگر درحقیقت یہ اخلاقی اور فکری انشائیہ ہے۔اس میں علم وفضل کے نام پر ریاکاری، معاشرتی تفاخر اور انسان کی سطحی سوچ پر زوردار طنز کیا گیا ہے۔یہی فن کا اصل کرشمہ ہے۔انشائیے کا اخلاقی پیغام یہ ہے کہ کسی کو حقیر نہ سمجھو اور یہ کہ علم کا اصل مقصد عمل، تفکر اور اخلاق کی بہتری ہے نہ کہ نمود ونمائش۔خواجہ صاحب نے طنز ومزاح کے ذریعے اصلاح معاشرہ کا کام کیا ہے جو ان کے ادبی اور روحانی شعور کی علامت ہے۔

اس انشائیے میں صوفیانہ رجحان بھی نمایاں ہے۔جھینگر کی عبادت دراصل دنیا سے بے نیازی کا طرز عمل اور مصنف کا اس کی موت پر رقت آمیز ردعمل سب میں وہی درد دل جھلکتا ہے جو تصوف کی اصل روح ہے۔خواجہ حسن نظامی کا جھینگر گویا ایک رمزی کردار ہے جو انسان کو اپنی حقیقت پہچاننے اور دنیا کی بے ثباتی کا احساس دلانے کے لیے آیا ہے۔وہ محض ایک کیڑا نہیں بلکہ ایک علامت ہے اس انسان کی جو دنیاوی علم کے بوجھ تلے دبا ہوا ہے مگر روحانی بصیرت سے محروم ہے۔

جھینگر کا جنازہ اپنی ساخت کے لحاظ سے ایک مکمل فنی انشائیہ ہے۔اس میں خیال کی روانی، زبان کی برجستگی، طنز کی تہ داری اور اسلوب کی انفرادیت سب موجود ہیں۔اس کا پلاٹ اگر چہ ایک واقعے پر مبنی ہے مگر واقعاتی ترتیب سے زیادہ اس میں تاثراتی ربط پایا جاتا ہے۔ مصنف کا انداز مکالماتی ہے اور یہی مکالماتی اسلوب انشائیے کو جاندار اور دلچسپ بناتا ہے۔قاری کو یوں محسوس ہوتا ہے جیسے وہ خود مصنف کے ساتھ بیٹھا جھینگر کی لاش پر تبصرہ سن رہا ہو۔

ادبی اعتبار سے دیکھا جائے تو یہ انشائیہ اردو طنزیہ ومزاحیہ نثر کی بہترین مثالوں میں سے ہے۔اس میں مزاح کا وہ اعلیٰ ذوق موجود ہے جو دل آزاری نہیں کرتا بلکہ دل کی اصلاح کرتا ہے۔خواجہ حسن نظامی کی نثر میں مزاح لطافت میں ڈھلا ہوا ہے، ان کے طنز میں تیزی نہیں بلکہ گداز ہے اور یہی ان کے فن کا امتیاز ہے۔انشائیہ قاری کو محظوظ بھی کرتا ہے اور متفکر بھی بناتا ہے۔یہی وہ دوہرا تاثر ہے جو ایک عمدہ انشائیہ کو محض تفریح سے بلند کر کے ادب کے دائرے میں لے آتا ہے۔

آخر میں کہا جا سکتا ہے کہ جھینگر کا جنازہ اردو ادب کا ایک شاہکار انشائیہ ہے، جس میں معمولی واقعے سے غیر معمولی معانی اخذ کیے گئے ہیں۔یہ طنز ومزاح کے پردے میں معاشرتی اصلاح، تعلیمی شعور، اخلاقی تربیت اور انسان دوستی کا پیغام دیتا ہے۔خواجہ حسن نظامی نے اپنی مخصوص سادہ، شگفتہ اور بامعنی زبان میں زندگی کا وہ سبق دیا ہے جو آج بھی تازہ محسوس ہوتا ہے۔یہی وہ انفرادیت ہے جو انہیں اردو نثر کے ممتاز فنکاروں میں ہمیشہ زندہ رکھے گی۔(ماخذ: سی پارہ دل)

خود اکتسابی کے لیے سوالات I

ایک جملے میں جواب لکھیں۔

1۔ خواجہ حسن نظامی کا اصل نام ۔۔۔۔۔تھا۔

2۔ نوجوانی میں وہ ۔۔۔۔۔اور دہلی کی تاریخی عمارتوں ۔۔۔۔۔ پھیری لگا کر بیچا کرتے تھے۔

3۔ انشائیہ جھینگر کا جنازہ ان کے مجموعہ ۔۔۔۔۔میں شامل ہے۔

4۔ خوجہ حسن نظامی کو ۔۔۔۔۔کے لقب سے یاد کیا جاتا ہے۔

5۔ خدا بخشے بہت سی ۔۔۔۔۔کا جانور تھا۔

6۔ یہ کالی ۔۔۔۔۔بھی افریقہ کے ۔۔۔۔۔سے کم نہیں۔

7۔ خواجہ حسن نظامی کے انشائیوں میں ۔۔۔۔۔اور ۔۔۔۔۔کا حسین امتزاج پایا جاتا ہے۔

8۔ جھینگر کی آواز کو مصنف نے ۔۔۔۔۔اور ۔۔۔۔۔کی علامت کہا ہے۔

9۔ جھینگر کی مونچھوں کو ۔۔۔۔۔سے تشبہ دی ہے۔

10۔ جھینگر حضرت ابن عربی کی کتاب۔۔۔۔۔میں چھپا بیٹھا تھا۔
11۔ جھینگر کی آواز کو غافلوں کے لیے۔۔۔۔۔اور عاقلوں کے لیے۔۔۔۔۔قرار دیا ہے۔
12۔ جھینگر کا جنازہ ہے۔۔۔۔۔۔۔سے نکلے۔
13۔ جھینگر کو مخاطب ہو کر کہا اے۔۔۔۔۔اے۔۔۔۔۔اے۔۔۔۔۔ ۔

3.2.3 زبان کی مہارتیں

زبان کی چاروں بنیادی مہارتوں میں لکھنا وہ مہارت ہے جو زبان کی فکری و تخلیقی قوت کو سب سے زیادہ واضح کرتی ہے۔لکھنا محض حروف و الفاظ کی ترتیب کا نام نہیں بلکہ یہ ایک سماجی، فکری اور تخلیقی عمل ہے جو زبان کے ذریعے انسان کے احساس، تجربے اور مشاہدے کو ایک منظّم تحریر کی شکل دیتا ہے۔زبان سیکھنے کے عمل میں یہ آخری مگر سب سے اہم مرحلہ ہوتا ہے کیونکہ یہ سننے، بولنے اور پڑھنے کے تمام تجربات کا نچوڑ ہوتا ہے۔

خواجہ حسن نظامی کا انشائیہ جھینگر کا جنازہ زبان کی اس مہارت کو سمجھنے اور برتنے کا ایک دل کش نمونہ پیش کرتا ہے۔اس انشائیے میں طنز و مزاح، احساس اور مشاہدے کی باریکیاں اس قدر خوبصورتی سے تحریر میں ڈھلی ہیں کہ قاری کو نہ صرف زبان کی لذت کا احساس ہوتا ہے بلکہ لکھنے کے فنی رموز سے بھی واقفیت پیدا ہوتی ہے۔جھینگر کا جنازہ لکھنے کی تربیت کے لیے اس اعتبار سے اہم ہے کہ اس میں لفظوں کے انتخاب، جملوں کی ساخت، مکالمے کی روانی اور بیان کے تسلسل سے طلبہ کو یہ سیکھنے میں مدد ملتی ہے کہ زبان کو کس طرح فنی اور ادبی انداز میں برتا جا سکتا ہے۔

لکھنے کی مہارت کا بنیادی مقصد یہ ہے کہ طالب علم اپنے خیالات کو درست، واضح اور بامعنی انداز میں تحریر کر سکے۔خواجہ حسن نظامی کی تحریر طلبہ کو اس بات کی تربیت دیتی ہے کہ ایک معمولی واقعے جھینگر کے مرنے کو بھی اگر فنکارانہ انداز میں پیش کیا جائے تو وہ معنی خیز اور اثر انگیز بن سکتا ہے۔انشائیہ نگار نے اس معمولی واقعے میں مزاح، غم، ہمدردی اور تخیل کو اس طرح یکجا کیا ہے کہ قاری کے سامنے ایک پورا سماجی منظر نامہ ابھر آتا ہے۔اس سے طلبہ کو یہ سمجھنے میں مدد ملتی ہے کہ لکھنے کا اصل کمال یہی ہے کہ چھوٹی بات کو بڑے مفہوم میں پیش کیا جائے۔

لکھنے کی مہارت میں الفاظ کا انتخاب، جملوں کی ساخت، املا کی درستی، اعراب و اوقاف کا صحیح استعمال اور بیان کی روانی بنیادی عناصر ہیں۔جھینگر کا جنازہ ان تمام پہلوؤں کی بہترین مثال ہے۔خواجہ حسن نظامی کے جملے مختصر مگر معنی خیز ہیں۔ان میں محاوراتی زبان کا حسن، روزمرہ کی سادگی اور بیان کی چاشنی موجود ہے۔طلبہ جب اس انشائیے کو پڑھ کر لکھنے کی کوشش کرتے ہیں تو وہ زبان کے اسلوب، جملے کے بہاؤ اور فقرے کے توازن کو سمجھنا سیکھتے ہیں۔

لکھنے کی مہارت اس وقت مؤثر بنتی ہے جب اس میں تخلیقی آزادی ہو۔ماہرین تعلیم کے مطابق ابتدائی تدریس میں طلبہ کو اپنے مشاہدات و خیالات کو اپنی زبان میں بیان کرنے کی آزادی دی جانی چاہیے۔جھینگر کا جنازہ اس پہلو سے ایک بہترین تدریسی نمونہ ہے کیونکہ اس میں تخیل کی پرواز اور احساس کی لطافت دونوں شامل ہیں۔طلبہ اس سے یہ سیکھ سکتے ہیں کہ مشاہدہ کس طرح تحریر میں ڈھلتا ہے اور کس طرح زبان جذبات کو ظاہر کرنے کا ذریعہ بنتی ہے۔

اردو میں لکھنے کی مہارت کا تعلق صرف الفاظ کے لکھنے سے نہیں بلکہ صحیح رسم الخط، املا، اور ساختی ترکیب سے بھی ہے۔خواجہ حسن نظامی نے اپنی تحریر میں الفاظ کے درست اور واضح استعمال سے یہ مثال قائم کی ہے کہ زبان کی صفائی اور درستگی لکھنے کے حسن کو بڑھاتی ہے۔مثلاً ان کے جملوں میں جو صوتی توازن اور محاوراتی نرمی ہے وہ لکھنے والے کے لیے عملی رہنمائی فراہم کرتی ہے۔طلبہ انشائیے کے مختلف فقروں کو نقل کر کے یا ان کی املا کی مشق کر کے اپنے لکھنے کے معیار کو بہتر بنا سکتے ہیں۔

تعلیمی نقطۂ نظر سے دیکھا جائے تو جھینگر کا جنازہ زبان سکھانے کے عمل میں لکھنے کی مہارت کے فروغ کے لیے بہترین مواد ہے۔اس سے

طلبہ میں نہ صرف املا اور ترکیب کی درستگی پیدا کی جاسکتی ہے بلکہ وہ اپنی تحریر میں مشاہدے، تجربے اور احساس کو شامل کرنے کا ہنر بھی سیکھتے ہیں۔ یہ انشائیہ لکھنے کی وہ مثال ہے جس میں زبان کی لطافت، سادگی اور اثر انگیزی بیک وقت موجود ہیں۔

آخر میں یہ کہا جا سکتا ہے کہ خواجہ حسن نظامی کا جھینگر کا جنازہ طلبہ کو یہ سکھاتا ہے کہ لکھنے کا عمل صرف الفاظ کا جوڑ نہیں بلکہ دل و دماغ کے اشتراک کا مظہر ہے۔ اس کے مطالعے سے لکھنے کی مہارت کے وہ تمام پہلو تخیل، مشاہدہ، درست املا، محاوراتی حسن اور فکری توازن نکھر کر سامنے آتے ہیں۔ جو طلبہ اس انشائیے کے اسلوب کو سمجھتے ہیں وہ نہ صرف بہتر لکھنا سیکھتے ہیں بلکہ زبان کی تہذیبی روح کو بھی محسوس کرنے لگتے ہیں۔ یہی جھینگر کا جنازہ کے مطالعے کا اصل تعلیمی ولسانی فائدہ ہے کہ یہ لکھنے کی مہارت کو فکری، تخلیقی اور تہذیبی سطح پر نکھارنے کا بہترین ذریعہ بن جاتا ہے۔

3.2.4 قواعد: فعل اور فاعل کی تعریف

فعل وہ ہے جس سے کسی کام کا کرنا، ہونا یا سہنا معلوم ہو جیسے حامد آیا، راشد گیا، احمد نے خط لکھا۔ ان مثالوں میں آیا، گیا اور لکھا فعل ہے۔

فعل کی حالتوں کے اعتبار سے مختلف قسمیں ہیں۔ طلبہ کے لیے چند ضروری اقسام پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ فعل کی معنی کے اعتبار سے تین قسمیں ہیں۔

فعل لازم: وہ ہے جس میں کسی کام کرنا پایا جائے مگر اس کا اثر صرف کام کرنے والے (فاعل) تک رہے۔ جیسے احمد آیا، فاطمہ گئی، زید بیٹھا۔ ان مثالوں میں آپ دیکھے گے کہ احمد کے آنے کا معلوم ہو گیا مگر یہ نہیں پتہ چلتا کہ کہاں سے آیا۔ اسی طرح دیگر مثالوں میں فاطمہ کہاں گئی یا زید کہاں بیٹھا۔

فعل متعدی: وہ فعل ہے جس کا اثر مفعول تک پہنچے۔ جیسے راشد بازار گیا۔ فاطمہ اسکول گئی۔ ساحل نے خط لکھا۔ ان مثالوں میں بازار، اسکول اور خط مفعول ہے۔

فعل ناقص: وہ فعل ہے جو کسی کام کے مکمل ہونے کو ظاہر نہیں کرتا بلکہ کسی حالت یا کیفیت کو بیان کرتا ہے۔ مثلا رقیہ بیمار ہے۔ عرفان چالاک تھا۔ پھول خوبصورت ہے۔

لوازم فعل یعنی فعل میں جن چیزوں کا پایا جانا ضروری ہوتا ہے اس میں سے ایک زمانہ ہے۔ زمانے کے اعتبار سے فعل کی تین قسمیں ہیں۔

فعل ماضی: وہ ہے جس میں کسی کام کا کرنا، ہونا یا سہنا گزرے ہوئے زمانے میں پایا جائے۔ جیسے زید اسکول گیا، عرفان نے کھانا کھایا۔

فعل حال: وہ فعل جو کسی کام کو موجودہ زمانے میں ہونے یا کرنے کو ظاہر کرے۔ جیسے انور کھیل رہا ہے۔ طلبہ لکھ رہے ہیں۔ محمود پڑھتا ہے۔

فعل مستقبل: وہ فعل ہے جس میں کسی کام کا کرنا، ہونا یا سہنا آنے والے زمانے میں پایا جائے۔ جیسے میں کل حیدرآباد جاونگا۔ احمد کل آئے گا۔ فاطمہ خط پڑھے گا۔ امجد کھیلے گا۔

اسم فاعل: وہ اسم ہے جو کام کرنے والے کو ظاہر کرے۔ یعنی کام کرنے والے کو فاعل کہتے ہیں۔ جیسے حامد نے کتاب پڑھی۔ ساجد دہلی گیا میں ساجد اور حامد اسم فاعل ہیں۔

خواجہ حسن نظامی کا انشائیہ جھینگر کا جنازہ طلبہ کے لیے فعل اور اس کی اقسام کو سمجھنے میں اہم ہے کیونکہ اس میں مختلف حالتوں اور اقسام کے افعال استعمال کیے گئے ہیں۔ طلبہ یہاں عملی جملوں میں دیکھ سکتے ہیں کہ کیسے فعل کسی کام کے ہونے، کرنے یا سہنے کو ظاہر کرتا ہے، کس فعل کا اثر صرف فاعل تک محدود ہے، کس فعل کا اثر مفعول تک پہنچتا ہے، اور کس فعل سے حالت یا کیفیت معلوم ہوتی ہے۔

فعل لازم:

آیا: میں نے کہا کیوں رے شریر تو یہاں کیوں آیا؟

بیٹھا: میں نے زور سے کتاب پر ہاتھ مارا جھینگر پھدک کر دوسری کتاب پر جا بیٹھا

فعل متعدی:

چاٹ گیا: میری سب کتابوں کو چاٹ گیا

مارا: میں نے زور سے کتاب پر ہاتھ مارا

کھینچے لیے: وہ اس کو دیوار پر کھینچے لیے چلی جاتی ہیں

دفن کر دیں گی: چیونٹیاں تو اس کو اپنے پیٹ کی قبر میں دفن کر دیں گی

فعل ناقص:

رہتا تھا: ہمیشہ دنیا کے جھگڑوں سے الگ کونے میں، کسی سوراخ میں، بوریے کے نیچے، آبخورے کے اندر چھپا بیٹھا رہتا تھا

فعل ماضی:

چاٹ گیا: میری سب کتابوں کو چاٹ گیا

دیکھا: ایک دن اس مرحوم کو میں نے دیکھا کہ حضرت ابن عربی کی فتوحات مکیہ کی ایک جلد میں چھپا بیٹھا ہے۔

مارا: میں نے زور سے کتاب پر ہاتھ مارا

فعل حال:

کہتا ہے: شام کے وقت عبادت رب کے لیے ایک مسلسل بین بجاتا تھا اور کہتا تھا کہ یہ غافلوں کے لیے صور ہے اور عاقلوں کے واسطے جلوہ طور ہے

ہنسنے لگا: جھینگر پھدک کر دوسری کتاب پر جا بیٹھا اور قہقہا مار کر ہنسنے لگا

فعل مستقبل:

گا: اب کون جھینگر کہلائے گا۔ ایسا مونچھوں والا کہاں دیکھنے میں آئے گا۔

ہاں تو ''جھنگر کا جنازہ ہے ذرا دھوم سے نکلے''

اسم فاعل:

میں نے زور سے کتاب پر ہاتھ مارا (میں فاعل)

جھینگر پھدک کر دوسری کتاب پر جا بیٹھا (جھینگر فاعل)

خواجہ حسن نظامی کے انشائیے ''جھینگر کا جنازہ'' میں فعل اور فاعل کی کثرت اور تنوع طلبہ کے لیے اس لیے اہم ہے کہ اس کے ذریعے مصنف کرداروں کی حرکات، احساسات اور طنزیہ انداز کو واضح کرتا ہے۔ اس متن سے طلبہ یہ سمجھ سکتے ہیں کہ فاعل کی درست پہچان سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ عمل کس کی طرف منسوب ہے، اور فعل کے انتخاب سے جملے میں معنی، تاثیر اور اسلوب پیدا ہوتا ہے، جس سے قواعد کے ساتھ ساتھ ادبی فہم بھی مضبوط ہوتا ہے۔

خود اکتسابی کے لیے سوالات II

صحیح یا غلط کی نشان دہی کیجیے۔

1۔ لکھنا زبان سیکھنے کے عمل کا پہلا مرحلہ ہے۔ صحیح / غلط

2۔ لکھنے میں املا، اعراب اور جملے کی ساخت غیر اہم عناصر ہیں۔ صحیح / غلط

3۔ یہ انشائیہ طلبہ کو فکری اور تہذیبی سطح پر زبان سمجھنے میں مدد دیتا ہے۔ صحیح / غلط

4۔ لکھنے کا عمل صرف الفاظ کا جوڑ ہے، احساس یا تخیل سے اس کا تعلق نہیں۔ صحیح / غلط

5۔ فعل لازم وہ ہوتا ہے جس کا اثر مفعول تک پہنچتا ہے۔ صحیح/غلط

6۔ زید بیٹھا فعل لازم کی مثال ہے۔ صحیح/غلط

7۔ پھول خوبصورت ہے فعل ناقص کی مثال ہے۔ صحیح/غلط

8۔ فعل مستقبل آنے والے زمانے میں ہونے والے کام کو ظاہر کرتا ہے۔ صحیح/غلط

9۔ انور کھیل رہا ہے فعل ماضی کی مثال ہے۔ صحیح/غلط

10۔ طلبہ کے لیے لکھنے کی مشق املا اور ترکیب کی درستی پیدا کرتی ہے۔ صحیح/غلط

3.3 الفاظ اور معنی

الفاظ	معنی
موذی	نقصان پہنچانے والا
تقلید	نقل کرنا، پیروی کرنا
لیاقت	قابلیت، اہلیت
خلوت نشین	اکیلا رہنے والا، تنہائی پسند
آبخوری	برتن، پانی پینے یا رکھنے کا برتن
صور	قیامت کا بگل
ویسٹ منسٹر ایبے	انگلینڈ کا مشہور چرچ (قبرستان)
بلائے بے درماں	لاعلاج بیماری
متوکل	خدا پر بھروسہ کرنے والا
شگفتگی	خوش مزاجی، تازگی
نکتہ رس	باریک بیں، سمجھدار
شکم پرست	لالچی، پیٹ کا پجاری
مرثیہ	مرنے والے پر لکھی جانے والی نظم
تصنیف	کتاب

3.4 خود اکتسابی سوالات کے جوابات

I

1۔ سید علی حسن

2۔ کتابیں۔تصویریں

3۔ سی پارۂ دل

4۔ مصور فطرت

5۔ خوبیوں

6۔ چوٹیاں۔مردم خوار سیاہ وحشیوں

7۔ مزاح۔اصلاح
8۔ محنت۔پیہم کوشش
9۔ قیصرولیم
10۔ فتوحات مکیہ
11۔ صور۔جلوۂ طور
12۔ ذرادھوم
13۔ پروفیسر۔فلاسفر۔متوکل درویش

II

1۔ غلط
2۔ غلط
3۔ صحیح
4۔ غلط
5۔ غلط
6۔ صحیح
7۔ صحیح
8۔ صحیح
9۔ غلط
10۔ صحیح

3.5 خلاصہ

خواجہ حسن نظامی کے انشائیے " جھینگر کا جنازہ" کے مطالعے کے ذریعے اس اکائی میں زبان کی اہم ترین مہارت " لکھنا" کو سمجھایا گیا ہے۔ لکھنا زبان کی وہ قوت ہے جو انسان کے خیالات، احساسات اور تجربات کو منظّم، بامعنی اور خوبصورت انداز میں ظاہر کرتی ہے۔ یہ محض الفاظ کی ترتیب نہیں بلکہ ایک فکری، سماجی اور تخلیقی عمل ہے۔

خواجہ حسن نظامی اردو نثر کے ممتاز انشا پرداز ہیں۔ ان کا انشائیہ " جھینگر کا جنازہ" طنز و مزاح، تصوف اور فکری گہرائی کا حسین امتزاج پیش کرتا ہے۔ بظاہر یہ ایک جھینگر کے مرنے پر مبنی مزاحیہ تحریر ہے، مگر اس کے پس منظر میں علم، اخلاق اور انسانی رویّوں پر گہرا طنز پوشیدہ ہے۔ مصنف نے جھینگر کو ایک علامتی کردار کے طور پر پیش کیا ہے جو اس انسان کی نمائندگی کرتا ہے جو کتابیں تو پڑھتا ہے مگر ان پر عمل نہیں کرتا۔ اس طرح یہ انشائیہ علم و عمل کے تعلق اور انسان کی فکری کمزوری پر روشنی ڈالتا ہے۔

اس اکائی کے ذریعے طلبہ یہ سیکھتے ہیں کہ اچھا لکھنا صرف الفاظ جوڑنے کا عمل نہیں بلکہ مشاہدے، تخیل اور احساس کو زبان کے ذریعے بامقصد انداز میں پیش کرنے کا ہنر ہے۔ خواجہ صاحب کی نثر میں سادگی، محاوراتی چاشنی، برجستگی اور طنز کی لطافت پائی جاتی ہے جو طلبہ کو زبان کی خوبصورتی اور فکری گہرائی دونوں سے آشنا کرتی ہے۔

اکائی کے قواعدی حصے میں فعل اور اس کی مختلف اقسام — لازم، متعدی اور ناقص — کے ساتھ زمانے کے اعتبار سے فعل کی تین حالتیں (ماضی، حال، مستقبل) تفصیل سے بیان کی گئی ہیں۔ اس کے علاوہ اسم فاعل کی وضاحت بھی کی گئی ہے تاکہ طلبہ جملوں میں فاعل اور مفعول

کی پہچان کرسکیں۔
طلبہ کی خود اکتسابی سرگرمیوں میں کچھ جملے دیے گئے ہیں جن میں وہ قواعدی پہچان (اسم،فعل،صفت وغیرہ) کی مشق کریں گے۔اسی کے ساتھ اردو سے انگریزی اور انگریزی سے اردو ترجمے کی مشق بھی شامل کی گئی ہے تاکہ وہ زبان کے عملی استعمال اور فہم میں مہارت حاصل کر سکیں۔
مجموعی طور پر یہ اکائی طلبہ میں تحریری اظہار،قواعدی سمجھ اور ترجمے کی صلاحیت کو بیک وقت مضبوط کرتی ہے۔" جھینگر کا جنازہ" کے مطالعے سے طلبہ نہ صرف زبان کے حسن کو محسوس کرتے ہیں بلکہ سوچنے، سمجھنے اور بہتر لکھنے کی مہارت بھی سیکھتے ہیں۔یہی اس اکائی کا بنیادی تعلیمی مقصد ہے

3.6 خود اکتسابی اکتسابی کے لیے مشق

تحریری سرگرمیاں: دیے گئے اقتباس میں اسم،ضمیر،صفت،فعل فاعل،مفعول،محاورا اور روزمرہ کی شناخت کریں

میری سب کتابوں کو چاٹ گیا۔ بڑا موزی تھا۔خدا نے پردہ ڈھک لیا۔افوہ جب اس کی لمبی لمبی دو مونچھوں کا خیال کرتا ہوں، جو وہ مجھکو دکھا کر ہلایا کرتا تھا تو آج اس کی لاش دیکھ کر بہت خوشی ہوتی ہے۔ بھلا دیکھ تو قیصر ولیم کی نقل اتارتا تھا۔اس جھینگر کی داستان ہرگز نہ کہتا، اگر دل سے یہ عہد نہ کیا ہوتا کہ دنیا میں جتنے حقیر و ذلیل مشہور ہیں، میں ان کو چار چاند لگا کر چمکاؤں گا۔ایک دن اس مرحوم کو میں نے دیکھا کہ حضرت ابن عربی کی فتوحات مکیہ کی ایک جلد میں چھپا بیٹھا ہے۔ میں نے کہا کیوں رے شریر تو یہاں کیوں آیا؟ اچھل کر بولا ذرا اس کا مطالعہ کرتا تھا۔سبحان اللہ۔تم کیا خاک مطالعہ کرتے تھے، بھائی یہ تو ہم انسانوں کا حصہ ہے۔ بولا واہ۔قرآن نے گدھے کی مثال دی ہے کہ لوگ کتابیں پڑھ لیتے ہیں مگر نہ ان کو سمجھتے ہیں اور نہ ان پر عمل کرتے ہیں۔لہذا وہ بوجھ اٹھانے والے گدھے ہیں جن پر علم و فضل کی کتابوں کا بوجھ لدا ہوا ہے۔مگر میں نے اس مثال کی تقلید نہیں کی۔خدا مثال دینی جانتا ہے۔تو بندہ بھی اس کی دی ہوئی طاقت سے ایک نئی شان پیدا کرسکتا ہے اور وہ یہ ہے کہ انسان مثل ایک جھینگر کے ہے جو کتابیں چاٹ لیتے ہیں سمجھتے بوجھتے خاک نہیں۔

کام کا تجربہ: دیے گئے جملوں کا اردو میں ترجمہ کریں۔

1. I wake up early in the morning.
2. She goes to school every day.
3. We are planning to visit our grandparents.
4. The teacher is explaining the lesson.
5. Please close the door quietly.
6. I have finished my homework.
7. They are playing in the garden.
8. He bought a new mobile yesterday.
9. The weather is very cold today.
10. Don't waste your time.

3.7 مشقی سوالات

1۔ خواجہ حسن نظامی کے سوانحی حالات پر روشنی ڈالیے۔؟
2۔ جھینگر کا جنازہ کا مرکزی خیال بیان کیجیے۔؟
3۔ جھینگر کا جنازہ کا فنی تجزیہ تحریر کیجیے۔؟
4۔ زبان کی مہارت لکھنا پر جھینگر کا جنازہ کے حوالے سے روشنی ڈالیے۔؟
5۔ فعل کی تعریف مع اقسام تفصیل سے بیان کیجیے۔؟

3.8 مزید مطالعے کے لیے کتب

1۔ خواجہ حسن نظامی حیات وخدمات، ڈاکٹر امام مرتضی نقوی، نسیم بک ڈپو لکھنؤ 1978
2۔ خواجہ حسن نظامی کی نثر، ڈاکٹر مولا بخش، عرشیہ پبلیکشن دہلی 2012
3۔ سی پارہ دل، خواجہ حسن نظامی، حضرت نظام الدین دہلی 2004

اکائی 4 : میر ناصر علی، شاہد احمد دہلوی

ساخت

4.0 مقاصد

4.1 تمہید

4.2 موضوع کی وضاحت

4.2.1 متن: میر ناصر علی، شاہد احمد دہلوی

4.2.2 میر ناصر علی کا فنی تجزیہ

خود اکتسابی کے لیے سوالات I

4.2.3 **زبان کی مہارتیں**: میر ناصر علی کے حوالے سے زبان کی مہارت بولنا کی اہمیت

4.2.4 **قواعد**: مفعول

خود اکتسابی کے لیے سوالات II

4.3 الفاظ اور معنی

4.4 خود اکتسابی سوالات کے جوابات I

خود اکتسابی سوالات کے جوابات II

4.5 خلاصہ

4.6 خود اکتسابی کے لیے مشق

تحریری سرگرمیاں: قواعد کی شناخت۔

کام کا تجربہ: دیے گئے اردو جملوں کا انگریزی میں لفظی ترجمہ کریں۔

4.7 مشقی سوالات

4.8 مزید مطالعے کے لیے کتب

4.0 مقاصد

اس اکائی کے مطالعہ کے بعد طلبا سے توقع کی جاتی ہے کہ وہ.....

- ☆ شاہد احمد دہلوی کے سوانحی حالات سے واقف ہوں گے۔
- ☆ شاہد احمد دہلی کی ادبی خدمات کو جان سکیں گے۔
- ☆ شاہد احمد دہلی کی خاکہ نگاری سے واقفیت حاصل کریں گے۔
- ☆ میر ناصر علی کے خاکہ کا مطالعہ کریں گے۔
- ☆ میر ناصر علی کے خاکہ کا فنی تجزیہ کر سکیں گے۔
- ☆ زبان کی مہارت بولنا سے آگاہ ہوں گے۔
- ☆ قواعد کی مشق کے ذریعے زبان کی ساخت کو سمجھ سکیں گے۔
- ☆ مفعول کے بارے میں معلومات حاصل کریں گے۔

4.1 تمہید

اکائی چہارم کا عنوان ''میر ناصر علی، شاہد احمد دہلوی'' ہے، جو اردو کے معروف ادیب، خاکہ نگار اور صاحب اسلوب نثر نگار شاہد احمد دہلوی کی تحریر ہے۔ شاہد احمد دہلوی اردو ادب میں انشا پردازی اور کردار نگاری کے حوالے سے نمایاں مقام رکھتے ہیں۔ ان کے خاکے محض کسی شخصیت کا تعارف نہیں ہوتے بلکہ اس کے باطن، عادات، فکر اور طرز زندگی کا عکس بھی پیش کرتے ہیں۔

اس اکائی میں پیش کیا گیا خاکہ ''میر ناصر علی'' ایک سنجیدہ، شائستہ اور علم دوست شخصیت کا خاکہ ہے۔ مصنف نے نہایت سادگی اور خلوص کے ساتھ میر ناصر علی کے مزاج، ان کی علم دوستی اور ان کے اخلاقی پہلوؤں کو بیان کیا ہے۔ اس مضمون کے مطالعے سے طلبہ کو نہ صرف ایک صاحبِ علم انسان کی زندگی سے واقفیت حاصل ہوگی بلکہ انہیں خاکہ نگاری کے فن اور اس کے اسلوب کو سمجھنے کا موقع بھی ملے گا۔

زبان کی چار مہارتوں میں سے اس اکائی میں بولنے کی مہارت پر خاص طور پر توجہ دی جائے گی۔ طلبہ کو موقع دیا جائے گا کہ وہ میر ناصر علی کی شخصیت، کردار اور مصنف کے مشاہدات پر اظہارِ خیال کریں۔ مختلف سرگرمیوں کے ذریعے انہیں سادہ، مؤثر اور رواں انداز میں بولنے کی مشق کرائی جائے گی تاکہ وہ اپنے خیالات کو اعتماد کے ساتھ پیش کر سکیں۔

قواعد کے حصے میں مفعول کے موضوع پر تفصیل سے گفتگو کی جائے گی۔ اس میں مفعول کی تعریف، اقسام اور مثالوں کے ذریعے وضاحت کی جائے گی تاکہ طلبہ جملے کی ساخت کو بہتر طور پر سمجھ سکیں۔ اکائی کے آخر میں خود اکتسابی مشقیں شامل ہیں جن کے ذریعے طلبہ کو جملوں میں اسم، فعل، فاعل، مفعول اور ضمیر کی پہچان کی مشق کرائی جائے گی۔ ساتھ ہی اردو سے انگریزی ترجمے کی مشقیں بھی دی گئی ہیں تاکہ طلبہ دونوں زبانوں میں مہارت حاصل کریں اور اپنی زبانی و تحریری صلاحیتوں کو نکھار سکیں۔ یہ اکائی طلبہ کو ادب فہمی، بول چال کی درستگی، قواعدی شعور اور لسانی مہارتوں کے امتزاج سے آشنا کرے گی، تاکہ وہ اردو نثر کے فنی حسن اور کردار نگاری کی باریکیوں کو بہتر طور پر سمجھ سکیں۔

شاہد احمد دہلوی کا تعارف:

شاہد احمد دہلوی اردو ادب کے صاحب طرز نثر نگار، مدیر، مترجم، خاکہ نگار اور ماہر موسیقی کے طور پر جانے جاتے ہیں۔ وہ ایک علمی اور ادبی خانوادے سے تعلق رکھتے تھے۔ ان کے دادا معروف اصلاحی ادیب ڈپٹی نذیر احمد تھے اور والد مولوی بشیر الدین احمد خود بھی ادبی ذوق رکھتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ شاہد احمد دہلوی کو کم عمری ہی سے علمی و ادبی ماحول میسر آیا، جس نے ان کی شخصیت اور فکر کو گہرا رنگ دیا۔ ان کی ولادت 1906 میں دہلی میں ہوئی۔ ابتدائی تعلیم حیدرآباد میں حاصل کی، پھر وہ علی گڑھ آئے اور آخر میں دہلی منتقل ہوئے جہاں مختلف تعلیمی اداروں سے اعلیٰ تعلیم مکمل کی۔ مطالعہ اور تحریر کا ذوق بچپن ہی سے ان کے ساتھ تھا۔ یہی شوق آگے چل کر ایک باقاعدہ ادبی مشن بن گیا۔ 1930 میں انہوں نے مشہور ماہنامہ ساقی جاری کیا جو اردو ادب کے رجحانات اور نئے فکری میلانات کا نمائندہ جریدہ بن گیا۔ شاہد احمد دہلوی نے نہ صرف اس رسالے کی ادارت کی بلکہ ساقی بک ڈپو کے نام سے ایک اشاعتی ادارہ بھی قائم کیا۔ تقسیم ہند کے بعد وہ پاکستان چلے گئے اور وہیں سے اپنی علمی و ادبی سرگرمیاں جاری رکھیں۔

شاہد احمد دہلوی نے اردو ادب کی تقریباً بیشتر نثری اصناف میں طبع آزمائی کی۔ ان کے مضامین، تراجم اور خاکے اردو نثر کے سرمائے میں بیش قیمت اضافہ ہیں۔ ان کی معروف تصانیف میں دہلی جو ایک شہر تھا، چند ادبی شخصیات، گنجینہ گوہر، دہلی کی بپتا، بزم خوش نفساں اور اجڑا دیار وغیرہ شامل ہیں۔ بطور خاکہ نگار وہ نہایت بلند مقام رکھتے ہیں۔ ان کے خاکے صرف افراد کی ظاہری تصویر نہیں بلکہ ان کی شخصیت کے باطن، فکر، مزاج اور عہد کی روح کو بھی سامنے لاتے ہیں۔ ان کے مشہور خاکوں میں منٹو، نذیر احمد دہلوی، میراجی، جوش ملیح آبادی، جگر مرادآبادی اور ناصر علی جیسے نام شامل ہیں۔ شاہد احمد دہلوی کی نثر سادہ، رواں اور ٹکسالی دہلوی زبان کی نمائندہ ہے۔ ان کے اسلوب میں ایک خاص نفاست، شائستگی اور تہذیبی رنگ جھلکتا ہے۔ ان کے نزدیک ادب صرف تفریح نہیں بلکہ تہذیبی شعور اور انسانی احساسات کی آئینہ داری ہے۔ شاہد احمد دہلوی کا انتقال 1967 میں ہوا۔

4.2 موضوع کی وضاحت

4.2.1 متن: میر ناصر علی

اللہ بخشے میر ناصر علی دلّی کے ان وضعدار شرفا میں سے تھے۔ جن پر دلّی کو فخر تھا۔ عجب شان کے بزرگ تھے۔ بزرگ میں نے انہیں اس لیے کہا کہ میں نے جب سے ہوش سنبھالا انہیں بزرگ ہی دیکھا۔ سوکھ کر چمرخ ہو گئے تھے۔ خشخشی ڈاڑھی پہلے تل چاولی تھی، پھر سفید ہو گئی تھی۔ کتری ہوئی لبیں، پوپلا منہ، دہانہ پھیلا ہوا، بے قرار آنکھیں، ماتھا کھلا ہوا، بلکہ گدّی تک ماتھا ہی چلا گیا تھا۔ جوانی میں سروقد ہوں گے، بڑھاپے میں کمان کی طرح جھک گئے تھے۔ چلتے تھے تو پیچھے دونوں ہاتھ باندھ لیتے تھے۔ مستانہ دار جھوم کے چلتے تھے۔ مزاج شاہانہ، وضع قلندرانہ۔ ٹخنوں تک لمبا کرتا۔ گرمیوں میں موٹی ململ یا گاڑھے کا، اور جاڑوں میں فلالین یا وائلہ کا۔ اس میں چار جیبیں لگی ہوتی تھیں جنہیں میر صاحب کہتے تھے۔ یہ میرے چار نوکر ہیں گلے میں ٹپکا یا گلوبند، سر پر کبھی کپڑے کی پچ گول ٹوپی اور کبھی صافہ۔ گھر میں روی کا کنٹوپ بھی پہنتے تھے اور اس کے پاکھے الٹ کر کھڑے کر لیتے، جب چُغہ پہنتے تو عمامہ سر پر ہوتا۔ اک بَرا پاجامہ، ازار بند میں کنجیوں کا گچھا۔ پاؤں میں نری کی سلیم شاہی، کسی صاحب بہادر سے ملنے جاتے تو انگریزی جوتا پاؤں میں اڑا لیتے۔

آپ سمجھے بھی یہ میر ناصر علی کون ہیں؟ یہ وہی میر ناصر علی ہیں جو اپنی جوانی میں بوڑھے سرسید سے الجھتے سُلجھتے رہتے تھے۔ جنہیں سرسید ازراہِ شفقت ناصحِ مُشفق لکھتے تھے۔ تہذیب الاخلاق کے تجدد پسند رُجحانات پر انتقاد اور سرسید سے سخن گسترانہ شوخیاں کرنے کے لیے آگرہ سے انہوں نے تیرہویں صدی نکالا، اور نیچریوں کے خلاف اِس دھڑلّے سے مضامین لکھے کہ ان کی دھوم مچ گئی۔'' تیرہویں صدی بند ہوا تو زمانہ۔ زمانہ کے بعد افسانہ ایام اور افسانہ ایام کے بعد ناصری نکالا۔ یہ بعد کے دونوں پرچے میر صاحب کے چھوٹے بھائی میر نصرت علی کے نصرت المطابع میں چھپتے تھے۔ جب میر صاحب پنشن لے کر دلّی ہی میں رہنے لگے تو انہوں نے اپنا ایک ہینڈ پریس لگا لیا اور اس کا نام مطبع ناصری رکھا۔ 1908 میں اسی مطبع سے میر صاحب نے 'صلائے عام' شائع کرنا شروع کیا جو ان کے سالِ وفات 1933 تک چھپتا رہا۔ یہ سب پرچے اعلیٰ اردو لٹریچر کے لیے وقف تھے اور ان میں بیشتر مضامین میر صاحب ہی کے ہوتے تھے۔

صلائے عام کے دو مستقل عنوان تھے پیرایہ آغاز اور مضمونِ پریشاں پیرایہ آغاز'' رسالے کا دیباچہ ہوتا تھا جس میں میر صاحب مضامین نظم و نثر کا تذکرہ بڑے انوکھے انداز میں کرتے تھے۔'' مضمونِ پریشاں'' ٹکڑے ٹکڑے مضمون ہوتا تھا جس کا ہر ٹکڑا ایک مکمل خیال پیش کرتا تھا۔ اسے دلِ صد پارہ یا ہزار جامہ سمجھنا چاہیے۔ میر صاحب پچیس سال تک اِن عنوانوں کے تحت خود لکھتے رہے۔ اور نت نئی بات کہتے رہے۔ نازک خیالی اور پاکیزہ بیانی ان کا شیوہ تھا۔ صاحبِ طرز ادیب تھے۔ ان کے اندازِ تحریر پر بہت سوں کو رشک آیا۔ بعض نے کوشش کر کے نقل اتارنی چاہی۔ تو دو فقرے بھی نہ لکھے گئے اور خون تھوکنے لگے۔ اردو میں انشائیۂ لطیف کے موجد میر صاحب ہی تھے۔ ان کا اندازِ بیان انہی کے ساتھ ختم ہو گیا۔ غضب کی علمیت تھی ان میں۔ انگریزی، فارسی اور اردو کی شاید ہی کوئی معروف کتاب ایسی ہو جس کا مطالعہ میر صاحب نے نہ کیا ہو۔ کتاب اس طرح پڑھتے تھے کہ اس کے خاص خاص فقروں اور پاروں پر سُرخ پنسل سے نشان لگاتے جاتے تھے اور کبھی کبھی حاشیے پر کچھ لکھ بھی دیا کرتے تھے۔ ہزاروں لاکھوں شعر فارسی اور اردو کے یاد تھے، حافظہ آخر تک اچھا رہا۔ انگریزی اچھی بولتے تھے اور اس سے اچھی لکھتے تھے۔ ساٹھ پینسٹھ سال انہوں نے انشا پردازی کی داد دی۔

نمک کے محکمے میں ادنی ملازم بھرتی ہوئے تھے، اعلیٰ عہدے سے پنشن لی۔ حکومت کی نظروں میں بھی معزز ٹھہرے خان بہادر کا خطاب ملا، دلّی میں آنریری مجسٹریٹ رہے، اور پاٹودی میں نو سال چیف منسٹر۔

میر صاحب فارسی اور اردو اور انگریزی کے بہت بڑے عالم تھے مگر عربی واجبی ہی جانتے تھے۔ ان کے باپ دادا نہایت جید قسم کے علماء میں شمار ہوتے تھے۔ اور مناظرہ کرنے میں انہوں نے اتنی شہرت پائی تھی کہ امام المناظرہ کہلاتے تھے۔ مگر میر صاحب کو مذہبیات سے کوئی طبعی مناسبت نہیں تھی۔ انہوں نے باپ سے چھپ کر انگریزی پڑھنی شروع کی تھی۔ جب ان کے والد کو اس کی سُن گُن ملی تو بہت ناراض

ہوئے اورانہیں سختی سے منع کیا۔مگر میر صاحب کا مطالعہ جاری رہااوراس کی پاداش میں انہیں گھر سے علیحدہ کر دیا گیا۔فرماتے تھے کہ'' گھر سے نکلنے کے بعد ہم نے عرب سرا میں پانچ روپے مہینے کی ٹیوشن کر لی۔عرب سرا آنے جانے میں بہت وقت لگتا تھا،اس لیے ہم یہ کرتے تھے کہ گھر سے دو کتابیں لے کر چلتے۔ایک کتاب جاتے میں ختم کر دیتے اور دوسری آتے میں۔یوں ہمارا راستہ بھی کٹ جاتا اور ہمارا مطالعہ بھی ہو جاتا۔''مطالعہ کی عادت انہیں ساری عمر رہی اور ساری دُنیا کا ادب اور فلسفہ انہوں نے چاٹ لیا۔

میر صاحب کو بحث مباحثہ کی عادت بالکل نہیں تھی۔''سچ کہتے ہو، سچ کہتے ہو''کہہ کر ٹال جاتے تھے۔اگر اتفاق سے کہیں الجھنا ہی پڑ جاتا تو ان کے علم کے سمندر میں جوار بھاٹا آ جاتا۔بس پھر حریف کا جب تک بیڑا غرق نہ کر لیتیا نہیں چین نہ آتا۔عربی کی کمی کو بعض دفعہ بُری طرح محسوس کرتے تھے۔معقولات میں تو بھلا کون ان سے جیت سکتا تھا۔البتہ جب کوئی منقولات پر اتر آتا تو میر صاحب ایک دم سے خاموش ہو جاتے۔فرماتے تھے کہ''مولوی صاحب عربی کے حوالے دینے لگتے ہیں، میں اس لیے خاموش ہو جاتا ہوں کہ ان کی بات میری سمجھ میں نہیں آتی،اور وہ یہ سمجھ کر خوش ہو جاتے ہیں کہ دیکھو کس دھڑلے سے قائل کیا۔

میر صاحب جب باتیں کرتے تو مسکراتے بھی جاتے۔ان کی باتیں عموماً ہنسی مذاق ہی کی ہوتی تھیں۔انہیں کبھی کسی سے سنجیدہ گفتگو کرتے یا علمی بحث کرتے میں نے نہیں دیکھا۔ہمیشہ ظرافت کی کوئی بات کہتے،اوروں کو ہنساتے اور خود بھی ہنستے،مگر ان کی ہنسی میں آواز نہیں ہوتی تھی۔مولویوں کا مذاق اکثر اڑاتے تھے۔ایک دفعہ نہ جانے مولویوں کی برات میں کیسے جا پھنسے۔دلہن والوں نے برات کو کھانا بھی دیا تھا۔میر صاحب دسترخوان پر تو بیٹھ گئے مگر کھانا انہوں نے نہیں کھایا۔ان کے ساتھ ان کا ایک کم عمر پوتا تھا۔اس سے بولے''تو کھالے''۔ جب لڑکا کھا چکا تو میر صاحب بولے''ابے جنت میں جھاڑو نہیں دے گا تو مولوی ناراض ہو جائیں گے۔''یہ کہہ کر ایک جغادری مولوی کی طرف دیکھ کر کہا''کیوں صاحب؟''اور پھر لڑکے سے بولے''رکابی کو اس طرح چاٹ کہ تُس بھی باقی نہ رہے۔''

میر صاحب کو اپنی بیوی سے بڑی محبت تھی۔ہر سال اپنی شادی کی سال گرہ منایا کرتے تھے۔تیسرے پہر سے گھر والے اور قریبی عزیز جمع ہونے شروع ہوتے۔کھان پان ہوتا۔بیوی دلہن بنتیں،مہمانوں کے ہالے میں آ کر بیٹھتیں اور میر صاحب انہیں ایک سونے کی انگوٹھی پہناتے۔مبارک سلامت کا شور مچتا،ہنسی مذاق کی باتیں ہوتیں۔اور ایک ایک کر کے رات گئے تک مہمان رخصت ہوتے۔بیوی کے انتقال کے بعد میر صاحب بیس پچیس سال جیئے مگر انہوں نے دوسری شادی نہیں کی،اور ادب وفلسفہ کے مطالعہ میں زیادہ منہمک ہو گئے۔

میر صاحب کی حویلی۔حویلی کا ہے کو محل سرا کہنا چاہیے۔۔۔کے تین حصے تھے۔زنانہ،جس میں کُشادہ دالان در دالان،مغل محرابوں والے، ان پر ٹاپٹی کے رُوی بھرے دبیز پردے پڑے ہوئے۔دالانوں میں دائیں بائیں کوٹھریاں تھیں۔پیش دالان کے آگے صحن چبوترہ۔اس کے پہلوؤں میں صحنچیاں۔نیچے کے رُخ دائیں جانب ایک سہ دری تھی جس میں کیواڑ لگا کر کمرہ بنالیا تھا۔اس میں ان کی چھوٹی بہو رہتی تھیں۔دالانوں کے اوپر آمنے سامنے دو بڑے کمرے تھے جن میں میر صاحب کے بڑے بیٹے اور ان کا کُنبہ رہتا تھا۔جہاں زنانہ مکان کی حد ختم ہوتی تھی۔اسی سے ملواں ایک اور حصہ تھا جس کا ایک دروازہ زنانے کے صحن میں کھلتا تھا۔اس حصہ میں ایک دالان تھا اور پہلو میں کمرے تھے۔مکان کے اس حصے میں میر صاحب کا کتب خانہ اور نوادر خانہ تھا۔زنان خانہ اور کتب خانہ کی پوری لمبان میں بازار کے رُخ ایک چوڑی پٹی پر مردانہ بنا ہوا تھا۔نیچے باراز کے رُخ دکانیں اور محل سرا کا مغلئی شان دار صدر دروازہ تھا جس کے بڑے بھاری کیواڑوں میں پیتلی گج کیلیں جڑی ہوئی تھیں۔اور ایک پٹ میں کھڑکی بھی کھلی ہوئی تھی۔اس کے اندر ڈیوڑھی تھی جس میں ایک بڑے سے تخت پر دربان بیٹھا رہتا تھا۔یہیں سے زنانہ مکان اور کتب خانے کو راستے جاتے تھے،بالا خانے پر دائیں طرف ایک برآمدہ تھا جس میں میر صاحب کا بیشتر وقت گزرتا تھا۔اس کے پیچھے ایک سکڑا کمرہ تھا جس میں میر صاحب کی مسہری اور کتابوں اور نوادر کی الماریاں تھیں۔اس کے پیچھے ایک چوکور سا بڑا کمرہ یا ہال تھا جس میں ادبی نشستیں ہوتی تھیں۔بعد میں اسی ہال میں باقی ماندہ کتب خانہ اور نوادر خانہ منتقل ہو گیا تھا۔کیونکہ نیچے سامان بہت چوری ہونے لگا تھا۔میر صاحب کی ایک بیٹی مع اپنے خاندان کے اس خالی حصے میں اٹھ آئی تھیں۔اوپر بائیں جانب بھی برآمدہ اور کمرہ در کمرہ تھا۔یہ حصہ پہلے میر صاحب کے چھوٹے بیٹے کے تصرف میں تھا،پھر ان کے پوتے

میاں انصار ناصری اس میں رہنے لگے تھے۔ یہ پورا مکان فراش خانہ میں ''نمک والوں کی حویلی'' کے نام سے مشہور تھا۔ کیونکہ میر صاحب نمک کے محکمے میں ملازم رہے تھے۔

جب میر صاحب پنشن لے کر دلّی آ گئے تو یہ حویلی بڑی پُر رونق ہوگئی تھی۔ جہاں تک ممکن ہوتا تھا میر صاحب اپنی اولاد کو اپنے سے جُدا ہونے نہیں دیتے تھے۔ بڑے بیٹے نے یکے بعد دیگرے کئی ملازمتیں کیں، آخر ہار کر گھر بیٹھ رہے تھے اور ''صلائے عام'' کا سارا انتظام میر صاحب نے انہیں سونپ کر دو سو روپے ان کے مقرر کر دیے تھے۔ چھوٹے بیٹے ملازمت کے سلسلے میں ہمیشہ باہر ہی رہے۔ زنانہ گھر میں دو بیاہی تیاہی بیٹیاں بھی رہتی تھیں۔ میر صاحب بڑے سریر چشم اور کُنبہ پرور آدمی تھے۔ اولاد اور اولاد کی اولاد کو تو خیر بھرتے ہی تھے دُور پرے کے رشتہ داروں کا بھی خیال رکھتے تھے۔ ایک صاحب تھے جو کتابت کرتے تھے، خط بہت اچھا نہیں تھا مگر میر صاحب نے انہیں ''صلائے عام'' کی کتابت کرنیکے لیے رکھ لیا تھا۔ انہی صاحب کے ایک صاحب زادے تھے انہیں اپنے مطبعِ ناصری کا منیجر مقرر کر لیا تھا۔ جنرل منیجر میر صاحب کے بڑے صاحبزادے تھے۔ مطبع ناصری نیچے میر صاحب ہی کی دکانوں میں سے ایک میں تھا۔

بالا خانہ پر ایک بہت بڑی کھلی ہوئی چھت تھی۔ جو دونوں طرف کے عملے کے درمیان صحن کا کام دیتی تھی۔ اس پر چاروں طرف پھولوں کے گملے لگے ہوئے تھے اور بیلیں چڑھی ہوئی تھیں۔ بیچ میں بازار کے رُخ ایک گز اونچی کرسی دے کر سنگِ مرمر کا ایک شہ نشین نصب کیا گیا تھا۔ اس میں بیٹھ کر بازار کی سَیر کی جا سکتی تھی اور اسی حصے میں کبھی مشاعرے ہوتے اور کبھی ''شبِ ماہ'' منائی جاتی۔

'شب ماہ' چودھویں کے چاند میں منائی جاتی تھی۔ اس میں خاص اہتمام کیا جاتا تھا کہ جہاں تک ممکن ہو ہر چیز سفید ہو۔ چنانچہ دھوپ ڈھلتے ہی چھڑکاؤ کیا جاتا۔ شام ہوتے ہوتے اجلی اجلی چاندنیوں کا فرش ہو جاتا۔ چاروں طرف سفید گاؤ تکیے لگ جاتے۔ چنگیروں میں چنبیلی اور موتیا کے پھول رکھے جاتے۔ اِدھر چاند کھیت کرتا ادھر مہمان سفید بُراق انگرکھے در بر اور سفید دوپلّیاں بر سر آنے شروع ہو جاتے اور تکیوں کے سہارے بیٹھتے جاتے۔ پیچوانوں سے خمیرے کی لپٹیں اٹھتی رہتیں، چاندی کی تھالیوں میں گنگا جمنی ڈبیاں رکھی ہوتیں۔ بڑی ڈبیا میں پان، اس سے چھوٹی میں چھالیا، اس سے چھوٹی ڈبیوں میں کسی میں چوگھڑا الائچیاں، کسی میں زردے کی ننھی ننھی گولیاں ورقِ نقرہ میں لپٹی ہوئیں۔ سفید بلور کے آب دانوں میں برف پڑی ہوئی، اِن کے گرد گلاس سجے ہوئے۔ جلسہ شروع ہونے سے پہلے دودھ کے شربت کا دَور چلتا۔ اس سے فارغ ہونے کے بعد مہمانوں ہی میں سے کسی کو صدر بنا کر بٹھایا جاتا اور محفل مشاعرہ شروع ہو جاتی۔ ایسے ویسے کا یہاں بھلا گزر کہاں۔ دلّی کے چیدہ چیدہ اہلِ کمال بُلائے جاتے تھے۔ ہندو مسلمان سبھی شریک ہوتے تھے۔ سب اپنا اپنا منتخب کلام سناتے اور خاطر خواہ داد پاتے۔ میر صاحب جیسے سخن سنج سے واہ واہ لینے کے سب مشتاق۔ میر صاحب کا داد دینے کا طریقہ سب سے نرالا ہے۔ وہ تڑپ کر داد دینے کے قائل نہیں ہیں۔ بڑے سکون سے شعر سنتے ہیں اور بڑے اطمینان سے داد دیتے ہیں۔ شعر کے ایک ایک لفظ پر ان کی نظر رہتی ہے۔ بھئی واہ۔ یہ لفظ اچھا آیا۔ یہ ٹکڑا اس میں خوب کہا۔ پہلا مصرع تو شاید کوشش کر کے میں بھی کہہ لیتا، مگر دوسرا مصرع تو میں کوشش کر کے بھی نہیں کہہ سکتا۔ اگر تم یوں نہ کہتے تو میں ناراض ہو جاتا۔ غرض کوئی دو گھنٹے ڈھائی گھنٹے یہ مشاعرہ جاری رہتا اور اسی شائستگی کے ساتھ برخاست ہوتا اور سارے مہمان مطمئن و خوش رخصت ہوتے۔

میر صاحب کا کتب خانہ ایک زمانے میں دلّی کے بہترین کتب خانوں میں شمار ہوتا تھا۔ یوں تو اس میں تمام علوم کی کتابیں تھی مگر تاریخ، ادب اور فلسفہ کی کتب کا ذخیرہ بے مثل تھا۔ افسوس کہ اس کتب خانے کی بہار ان کی زندگی ہی میں لٹ چکی تھی۔ اس کی بیش بہا کتب چوری ہو کر کوڑیوں کے مول ردّی خریدنے والے کباڑیوں میں پہنچتی رہیں۔ میر صاحب اکثر اپنی کتابیں چوک سے دوبارہ خرید لایا کرتے تھے پھر وہ اپنے لُٹنے پر قانع ہو گئے تھے۔ ان کے انتقال کے وقت بھی ان کے لٹے گھٹے کتب خانہ میں چار ہزار کتابیں تھیں جو ان کے ورثا میں تقسیم ہو گئیں اور ان کا کتب خانہ سخی کے دل کی طرح صاف ہو گیا۔

نوادر جمع کرنے کا بھی میر صاحب کو شوق تھا۔ کتب خانے کا ایک حصہ عجائب خانہ بنا ہوا تھا۔ اس میں قلمی تصویریں، خطاطی کے نمونے، قطعات، دست کاری کے اعلیٰ نمونے، تاریخی نوادر، قلمی کتابیں، سکے اور بعض بے حد قیمتی چیزیں شامل تھیں۔ کتب خانہ اور عجائب خانہ میں

کسی کو جانے کی اجازت نہیں تھی۔ جب میر صاحب خوب جانچ لیتے تھے کہ واقعی کوئی قدر دان آ پہنچا ہے تو اسے ازراہِ نوازش خود اپنے ساتھ لے جاتے تھے، اور پھر غضب یہ کرتے کہ اس کا امتحان لیتے۔ اچھا بتاؤ تمہیں اس تصویر میں کیا خوبی نظر آتی ہے؟ میر پنجہ کش کی اس وصلی میں تم نے کیا بات دیکھی؟ اگر کسی نے کوئی قرینے کی بات جواب میں کہہ دی تو میر صاحب خوش ہو کر اسے ایک ایک چیز دکھاتے، اور اگر کوئی اینڈی بینڈی اس کے منہ سے نکل گئی تو میر صاحب کی طبیعت مکدر ہو جاتی اور فرماتے کیوں آپ اپنا اور میرا وقت ضائع کرتے ہیں؟ یہ آپ کے ذوق کی چیزیں نہیں ہیں، کہیں اور جا کر اپنا جی بہلایئے۔ اور باہر لا کر اسے بڑی رکھائی سے رخصت کر دیتے۔ اسی کھرے پن سے لوگ میر صاحب سے گھبراتے تھے اور اکثر انہیں سنکی سمجھتے تھے۔

میر صاحب کا تعلق چونکہ انگریز افسروں سے رہتا تھا اس لیے انہی کو خوش رکھنے کی تدبیریں کرتے رہتے تھے۔ ان کی یہ کمزوری اس قدر بڑھ گئی تھی کہ جو بھی انگریز دکھائی دیتا اسے سلام کر لیتے، کہتے تھے کہ ''کیا خبر کوئی بڑا افسر ہو یا کل کو یہی کوئی بڑا افسر بن کر آ جائے۔ فلاں صاحب کو دیکھو نا، پہلے پولیٹیکل ڈیپارٹمنٹ میں ادنی افسر تھے، پھر محکمہ نمک میں کمشنر بن گئے، اور اب دلّی کے چیف کمشنر بن کر آ گئے ہیں۔'' مگر میر صاحب نے اپنی انگریز پرستی اور حکام رسی سے کوئی فائدہ نہیں اٹھایا۔ ہمیشہ ان کی خدمت کرنے پر آمادہ اور ان پر احسان کرنے کی فکر میں لگے رہے۔ ایک دفعہ بہت کہنے سننے سے اپنے لڑکے کی سفارش کرنے ایک انگریز افسر کے پاس گئے۔ وہ میر صاحب کا بڑا پرانا قدر دان تھا۔ میر صاحب سے مل کر بہت خوش ہوا اور بار بار کہتا رہا بتاؤ میں تمہارے لیے کیا کر سکتا ہوں؟ اور میر صاحب یہی کہتے رہے کہ میں تو حضور کے سلام کو حاضر ہوا تھا۔ غرض صحیح گئے اور سلامت آئے۔ گھر والوں نے جب شکوہ کیا تو بولے میں نے پہلے ہی کہہ دیا تھا کہ مجھ سے کسی کی سفارش نہیں ہو سکتی۔'' ایک دفعہ گھر والوں نے میر صاحب کو اس پر آمادہ کیا کہ آپ صرف اپنے لڑکے کو اپنے ساتھ لے جائیں، سعی سفارش کچھ نہ کریں۔ میر صاحب بادلِ ناخواستہ چلے گئے اور صاحب بہادر ان سے مل کر خوش بھی بہت ہوئے، مگر جب انہوں نے پوچھا یہ آپ کا لڑکا ہے؟ تو میر صاحب کی رگِ ظرافت پھڑک گئی۔ بولے' یہ تو اس کی ماں بتا سکتی ہے۔ بات قہقہوں میں اڑ گئی اور لڑکے کو بے نیلِ مرام کے علاوہ پشیمان بھی لوٹنا پڑا۔

مگر میر صاحب انگریز سے بالکل دب کر نہیں رہ گئے تھے، کبھی کبھی انہیں حرارہ بھی آ جاتا تھا۔ ایک دفعہ کسی یورپی مستشرق کو سلطان جی کی درگاہ دکھانے لے گئے۔ خواجہ حسن نظامی نے درگاہ کے دروازے پر ان کی پذیرائی کی۔ انگریز کے جوتے صاف کرا کے خواجہ صاحب نے درگاہ میں داخل کر دیا۔ مگر میر صاحب سے کہا'' آپ جوتے اتار کر اندر آ جایئے۔'' میر صاحب اس امتیاز پر برہم ہو گئے۔ بولے'' اگر جوتے اتارنا بے عزتی ہے تو میں اس گورے کے سامنے بے عزت ہو کر اندر جانا نہیں چاہتا۔'' چنانچہ میر صاحب وہیں کھڑے رہے اور خواجہ صاحب انگریز کو درگاہ میں گھما لائے۔ واپسی پر خواجہ صاحب نے میر صاحب سے کہا'' آپ عمامہ باندھے ہوئے ہیں اور مولویوں کا چغہ بھی ہے۔ پھر فل بوٹ کیوں پہنے ہوئے ہیں؟'' میر صاحب نے چیخ کر جواب دیا'' پاؤں میں پہنا ہے سر پر تو نہیں اوڑھا اور ہاں تم ایسے سوال کیوں کرتے ہو؟

میر صاحب میں پرانے فلسفیوں کی سی بد دماغی تھی۔ کبھی کبھی ان پر زڑ بھی سوار ہو جاتی تھی۔ حد ہے کہ میر صاحب کی بیٹی کی شادی ہوئی تو وقتِ رخصت دولہا نے حاضر ہو کر سلام کرنے کی اجازت چاہی۔ میر صاحب نے اجازت نہیں دی۔ اس پر دولہا والوں میں بڑی چرغم چرغم ہوئی۔ دولہا کے ماموں بھی خان بہادر تھے۔ انہوں نے کہلا بھیجا کہ اگر اجازت ہو تو میں ملاقات کے لیے حاضر ہوں؟ اس کا جواب یہ آیا کہ'' آپ میری طبیعت سے واقف نہیں۔ میں آپ کے مذاق سے آشنا نہیں، آپ دولہا کے ماموں ضرور ہیں مگر اس کے یہ معنی تو نہیں کہ آپ میرا اور اپنا دونوں کا وقت ضائع کریں۔'' چنانچہ برات یوں ہی رخصت ہو گئی۔

میر صاحب دراصل اپنے آگے کسی کو گردانتے نہیں تھے۔ نوجوانوں سے تو اور بھی بھڑ کتے تھے۔ ایک خاصے نامی گرامی ادیب دلّی آئے تو فرطِ عقیدت سے میر صاحب کے گھر ان سے ملنے پہنچ گئے۔ طوعاً و کرہاً میر صاحب نیا نہیں باریابی کی اجازت دی۔ انہوں نے نہایت ادب سے جھک کر سلام کیا۔ جواب ملا'' بندگی''۔ وہ بے چارے سٹ پٹا گئے۔ گھبرا کر بولے صُلاّے عام میرے نام جاری کر دیجیے۔ یہ

پانچ روپے ہیں چندے کے۔''میر صاحب نے سر سے پاؤں تک انہیں دیکھا اور بولے' صلائے عام تمہاری سمجھ میں نہیں آ سکتا۔''یہ کہہ کر پھر کتاب پڑھنے لگے۔عقیدت مند نے بڑی لجاحت سے کہا'' آپ کو زحمت دینے کی معافی مانگتا ہوں۔''میر صاحب نے تنک کر کہا'' میاں صاحب زادے معافی کیا مانگتے ہو، بھیک مانگو، بھیک!'' وہ بے چارے اپنا سا منہ لے کر وہاں سے چلے آئے۔غلط اردو سُن کر میر صاحب آپے سے باہر ہو جاتے تھے۔

میر صاحب کی نظر ایک ایک لفظ پر رہتی تھی۔لکھنے میں خود اتنے محتاط تھے کہ جو کچھ لکھتے تھے اسے بار بار پڑھتے تھے، اور اگلے دن صبح کو سب سے پہلا کام یہ کرتے کہ اپنے مضمون کی نوک پلک درست کرتے۔ایک دن ایک صاحب مضمون لکھ کر لے گئے جس کا عنوان تھا'' داغ کی شاعری پر ایک نظر''میر صاحب نے عنوان دیکھتے ہی فرمایا'' ایک نظر کیوں؟ دو نظر کیوں نہیں؟'' یہ کہہ کر مضمون واپس دے دیا۔یوں بھی وہ'' صلائے عام''میں لگے بندھے آدمیوں کے مضمون چھاپتے تھے۔جو شخص نواب سائل سے بے دھڑک کہہ دیتا ہو'' ابے یار تُو تو نواب ہے، شاعر کہاں ہے۔''وہ بھلا کسی اور کی کیا رکھتا۔

میر صاحب کتابوں اور پرانی چیزوں کی تلاش میں روزانہ عصر کے وقت فراش خانہ سے جامع مسجد تک پیدل جایا کرتے تھے۔آندھی جائے مینہ جائے ان کا پھیرا ناغہ نہیں ہوتا تھا۔کمر پر ہاتھ باندھے ٹھیکیاں لیتے ہوئے جاتے۔پیچھے پیچھے ایک ملازم ہوتا جس سے گھریلوں باتوں سے لے کر فلسفیانہ نکات تک بیان کرتے چلے جاتے، اور وہ'' جی حضور، جی حضور'' کہتا رہتا۔چوک پر پہنچتے ہی کباڑیے اور پرانی کتابوں والے انہیں گھیر لیتے۔''نواب صاحب، یہاں آیئے۔''اجی ڈپٹی صاحب، دیکھیے کیا چیز رکھی ہے میں نے آپ کے لیے۔حضور دیکھیے کیسا تحفہ مال لایا ہوں۔''اور میر صاحب ایک ایک چیز کو دیکھتے، مول تول کرتے اور پیسوں کی چیز روپوں میں خرید کر خوش خوش گھر لوٹتے۔کبھی بہت موج میں ہوتے تو کسی برابر سے گزرتے ہوئے لونڈے کے سر پر چپت جما دیتے، وہ پلٹ کر موٹی سی گالی دیتا تو یہ اس گالی کا مزہ لیتے۔اوہو ہو ہو، آہاہاہا۔دلّی کا روڑا ہے، کیا پری دماغ پایا ہے۔'' کرتے آگے بڑھ جاتے۔

اپنے بچوں سے اور بچوں سے میر صاحب کو بڑی محبت تھی۔یوں تو ہوّا سمجھ کر اس کے پاس ایک بھی نہیں پھٹکتا تھا۔مگر تیسرے پہر کی چائے میں سب کو جمع ہونے کا حکم تھا۔اس لیے خوب رول چول رہتی۔مزے مزے کی باتیں ہوتیں۔دن بھر کے گھریلوں جھگڑے قصے چُکائے جاتے۔بسکٹ، پنیر، نمکین چیزوں کا دَور چلتا۔میر صاحب چائے کے بڑے شوقین تھے۔جس زمانے میں چائے آٹھ آنے پونڈ بکتی تھی۔میر صاحب سر بند چائے پانچ روپے پونڈ سے کم کی نہیں پیتے تھے۔فرماتے تھے کہ اس سے زیادہ کی مجھ میں ہمت نہیں۔جب پیالیوں میں چائے ڈالی جاتی تو کہتے سونے کا پانی ہے، سونے کا پانی''اور جب اس میں دودھ ڈالا جاتا تو کہتے'' اوہو ہو ہو، بادل اٹھ رہے ہیں۔

بد دماغی کے باوجود کبھی اپنی ناقدری کا ملال بھی انہیں ضرور ہوتا تھا۔فرماتے تھے'' کبھی کسی اہل کمال کی اس کے وقت میں نہ قدر ہوئی ہے نہ ہوگی۔اب ہر شخص کی زبان پر غالبؔ اور مرزا غالب ہے۔زندگی میں غریب کو کوئی پوچھتا تک نہیں تھا۔ہم نے دیکھا ہے کہ کرایہ کے ادنی مکان میں پڑے رہتے تھے۔بے چارے کو نہ گھر کا گھر نصیب ہوا نہ آرام سے کھانا نصیب ہوا۔زندگی بھر مصیبتیں جھیلتے جھیلتے مر گئے۔اب غالب پرستی شروع ہوئی ہے، فرمایئے غالبؔ کے کس کام کی۔

سنتے چلے آئے ہیں کہ پہنے جگ بھاتا اور کھائے من بھاتا، مگر میر صاحب پہننے اور کھانے دونوں میں اپنی پسند کو ترجیح دیتے تھے۔خوش خوراک اور نفیس مزاج آدمی تھے۔کھانا پکانے پر رکاب دار خانساماں ان کے ہاں نہیں رکھا جاتا تھا، مامائیں رکھی جاتی تھیں۔میر صاحب ازراہِ تفنن کہتے تھے کہ'' جب تک آٹا گوندھنے میں چوڑیوں کی دھووَن شامل نہ ہو روٹی میں مزہ کیسے آ سکتا ہے؟ ویسے اوپر کے کام پر بڈھے اور لڑکے ہمیشہ نوکر رکھے جاتے تھے۔دونوں وقت کا کھانا زنانے میں سے پک کر آتا تھا۔صبح اور تیسرے پہر کی چائے کا اہتمام مردانے میں خود کرتے تھے۔

یہ عجیب بات ہے کہ میر صاحب کو اپنی زندگی میں عورت سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔بلکہ ایک طرح سے عورت سے متنفر کہے جا سکتے ہیں۔ان کے کسی پرچے میں عورت کا کوئی مضمون یا غزل کبھی نہیں چھپی۔کبھی کسی خاتون کا تذکرہ تک انہیں منظور نہ تھا۔دراصل جب وہ مردوں ہی

کونہیں گانٹھتے تھے تو بھلا عورتوں کو کیا گھاس ڈالتے۔مگر ان کی یہ نفرت بس اسی حد تک تھی۔ورنہ عورت کی تعریف میں تو انہوں نے ایسے ایسے نفیس نفسیاتی نکتے بیان کیے ہیں کہ مہدی افادی جیسا بانکا ادیب بھی پھڑک کر کہتا ہے میں آپ میں یونانیوں کی سی لطافتِ خیال پاتا ہوں۔''اور پھر میر صاحب ہی کے انداز بیان سے متاثر ہو کر اپنا وہ بے پناہ مضمون پیش کرتا ہے جس میں اس نے فلسفہ حسن وعشق بیان کیا ہے۔میر صاحب کے مضامین میں عورت کے متعلق اَن گنت نشر ہیں۔ان میں سے چند یہاں نقل کرتا ہوں۔

عورت جب منہ پھیر کر چلنے کے لیے اٹھ کھڑی ہو تو اس کے یہ معنی ہیں کہ یہ چاہتی ہے کیکہ کوئی دوڑ کر دامن پکڑ لے۔

عورت کے لیے اس قدر بس نہیں ہے کہ مرد کا دل ہاتھ میں رکھے بلکہ جب ہاتھ آجائے تو تنگ رکھے کہ یہی نسخہ تسخیر ہے۔

اکیلے مے نوشی عیش میں داخل نہیں۔کسی غارت گر دین آفتِ ہوش کے ساتھ اگر یہ لُطف مسرع ہو تو ایسے مس ھ رحمتِ الٰہی پر ایمان نہ رکھنا ضعفِ عقائد مس ہ داخل ہے۔

کسی کے خیال میں اپنی جان کو خوش رکھنا بُرا نہیں۔خاص کر ایسی محبت جس میں یار کا مسکرانا یہ بتائے کہ

نہ دیکھ اس وقت میں ہوتی ہوں بدنام

محبت وہ چیز ہے جو سامان واسباب کی محتاج نہیں۔محبت کے لیے ایک اکیلا دل چاہیے۔

عورت کیسی ہی آوارہ کیوں نہ ہو مگر پارسائی پر جان دیتی ہے۔

حسینوں کو شاعروں سے شاعر مزاج زیادہ پسند ہیں۔ان کے لیے موزونی طبع بے کار ہے۔ان کو اس خیال میں مزہ آتا ہے کہ کسی کو ہمارا خیال ہوا اور ہمیں کسی کا۔

وہ حسین بھولنے کی چیز نہیں جو لڑکپن سے نکلتی جوانی میں کسی کے خیال میں ہو۔ایسی عورت کو اپنے چاہنے والے سے یہ سننے کی تاب نہیں کہ رات زیادہ گئی ہے۔اس کی ایک رات الف لیلہ کی ہزار رات سے بہتر ہے۔

یہ عورت جو دامن کشاں جارہی ہے اس کو آپ کی بے التفاتی کا رنج ہے۔یہ چاہتی ہے کہ آپ کسی اور کی طرف نہ دیکھیں۔

حسین عورت جب کسی سے بچ کر نکلے تو اس کا اس قدر نقصان نہیں جس قدر کہ اپنا ہے۔

آپ یہ نہ سمجھیں کہ مرد عورت سے بازی لے جاتا ہے۔مرد اگر کسی عورت کو دغا دے تو بھی عورت ہی کا مارا سمجھیے۔

تمام عالم میں حسینوں کی کم سنی سے زیادہ کوئی چیز دل سے قریب نہیں۔جن کی کھلی یا بندھی سر کی چوٹیاں درازی عمر کا جواب ہیں۔

خدا نے عورت کو بالطبع عیش پسند کیا ہے۔عورت کے لیے عیش سلطنت کا جلوس ہے۔

عورت کے پاؤں فرشِ مخملیں چاہتے ہیں۔مرد کے پیر کانٹوں کے لیے بنے ہیں۔

مصائب میں عورت کا حال شاخِ گل کا سا ہے جو آندھی میں جھک جاتی ہے اور جہاں ہوا تھمی پھر سیدھی ہو گئی۔

عورت کا دماغ ہمیشہ بہار کا نمونہ سمجھیے جس میں خزاں کو دخل نہیں۔

عورت جس بات کا ارادہ کر لے کر گزرتی ہے۔اس لیے محبت میں زیادہ لطف اس محبت کا ہے جو عورت کی طرف سے ہو کہ اگر عورت چاہے تو سو بہانہ سے ملے گی۔وہی نہ چاہے تو ملنا معلوم

یہ اگر چاہیں تو پھر کیا چاہیے؟

کہتے ہیں کہ محبت میں ہوش نہیں رہتا۔میری رائے میں مرد کو ہوش نہیں رہتا۔عورت کو ہوش رہتا ہے۔

عورت کو معلوم ہے کہ میں اکیلی بے کار ہوں۔میری زندگی کا مدار دوسرے پر ہے۔جو غیر جنس (مرد) ہے۔

عورت جس کی عمل داری میں رہتی ہے اس پر حکومت کرتی ہے۔

یہ بات عورت کی عادت میں داخل ہے کہ منہ چھپائے اور حُسن التفات کا دعویٰ کرے۔

عورت کو چپکے ہی چپکے گھر میں جان دیتے سنا۔

مرد عشق کرتے ہیں مگر عورت عشقِ مجسم ہے۔
عورت میں محبت کے سوا کسی چیز کی قابلیت ہی نہیں۔
محبت بغیر عورت جی نہیں سکتی۔ مرد اور طرح بھی جی سکتا ہے۔
عورت کے دل میں محبت جس قدر جلد اثر کرتی ہے اسی قدر دیر پا بھی ہے۔
عورت کے لیے نری پارسائی کافی نہیں۔ دل رُبائی اور دل فریبی بھی ضروری ہے۔

میر صاحب کی آدم بیزاری کا ایک سبب یہ بھی تھا کہ طوالتِ عمر کی وجہ سے ان کی تقریباً سارے ساتھی ایک ایک کر کے اٹھ گئے تھے اور وہ اس بھری دُنیا میں اکیلے رہ گئے تھے۔ حد یہ کہ ان کے چھوٹے بھی ان کے سامنے ہی رخصت ہو گئے۔ مولوی نصرت علی، میر صاحب کے چھوٹے بھائی جو تین سال چھوٹے تھے ان سے چھ مہینے پہلے سدھار گئے۔ یہ بھی عجب شان کے بزرگ تھے۔ سو سے زیادہ ان کی تصانیف ہیں، ایک لُغت بھی انہوں نے سات زبانوں کی مرتب کی تھی۔ اپنا چھاپہ خانہ اور اپنا اخبار تھا۔ سالہا سال تک ان کا اخبار چھپتا رہا مگر آج نصرت علی مرحوم کو کوئی بھی نہیں جانتا۔ خود میر ناصر علی کو لوگ ان کی زندگی ہی میں بھول گئے تھے۔ ان کے مرنے پر جب ''ناصر نمبر'' ساقیؔ نے نکالا تو لوگ چونکے کہ ہائیں، کوئی اتنا بڑا ادیب بھی تھا جو مر گیا؟ کتنی بے رحم ہے موت اور کتنا بے رحم ہے زمانہ! ناصر علی کی موت پر ریاضؔ اور دلؔ گیر جیسے دو چار بڈھے ٹھڈے رو لیے اور بس۔ ہماری بے حسی تو بفضلہٖ اس دیہاتی عورت کی طرح قائم ہے جس نے اکبر بادشاہ کی سناؤنی سُن کر کہا تھا کہ ''جب چھیدو کا باپ نہ رہا تو اکبر کیسے رہ جاتا۔

میر صاحب بڑے سمجھ دار آدمی تھے۔ وہ جانتے تھے کہ بڑھاپے میں آدمی کس ہڈرے کو پہنچ جاتا ہے۔ کسی انگریزی کتاب میں انہوں نے پڑھا تھا کہ بڑھاپے میں سب سے دور رہنا ہی ٹھیک ہوتا ہے۔ جب آدمی ساٹھ سال کا ہو جائے تو اسے اپنی زندگی یکسر بدل لینی چاہیے۔ اپنی صورت شکل اور لباس کا زیادہ خیال رکھنا چاہیے۔ اس سے جی ذرا ہلکا رہتا ہے، کوئی نہ کوئی مشغلہ اس عمر میں ضرور ہونا چاہیے۔ ساٹھ سے نوے سال کی عمر تک جنازوں میں شریک نہیں ہونا چاہیے کیونکہ کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ کسی کو دفنانے کے بعد اپنے دفنائے جانے کی باری آ جاتی ہے۔ شادی بیاہوں میں اور عام جلسوں میں شرکت مناسب نہیں ہوتی۔ کیونکہ اِن سے الجھنیں پیدا ہوتی ہیں۔ اور الجھنوں سے عمر کم ہوتی ہے۔

میرے والد سے میر صاحب کے گونا گوں تعلقات تھے، عزیز داری کے، مضمون نگاری کے، وظیفہ خواروں کی انجمن کے۔ مگر میر صاحب کو میں نے ان کے جنازے میں نہیں دیکھا۔ بعد میں پُرسا دینے البتہ آئے تھے۔ گھر میں داخل ہوتے ہی بولے' چلا گیا۔ ہمارا یار چلا گیا۔ جلدی چلا گیا۔ اچھا آدمی تھا۔

مضمون نگاری، مطالعہ اور نوادر جمع کرنا، یہ سب مشغلے ایسے تھے کہ ان کے بعد میر صاحب کو نہ تو کسی سے ملنے کی فرصت ہوتی تھی نہ ضرورت۔ بچوں کے بچوں سے ان کا جی بہلتا ہی رہتا تھا، کوئی ملنے آ جاتا تو انہیں طبیعت پر جبر کر کے اس سے ملنا پڑتا۔ جانتے تھے کہ کم علمی کی اور بیکار باتیں کرے گا، اس لیے رُکھائی سے ملتے تھے۔ طبیعت بھی بڑی بے نیاز پائی تھی۔ نہ ستائش کی تمنا نہ صلے کی پروا۔ ساری عمر ان کے قدر دان ان سے اصرار کرتے رہے کہ اپنے مضامین کے منتخب مجموعے چھاپ دیجیے۔ مگر انہوں نے کبھی اس کا خیال بھی نہیں کیا۔ میر صاحب کوئی ساٹھ برس کے ہوں گے جب مہدی افادی نے مجموعہ مضامین نہ چھاپنے کے سلسلے میں انہیں لکھا تھا۔

اس پاکیزہ مجموعے کی ترتیب سے اردو ادبِ عالیہ میں آپ کی طرف سے مُستقلاً قیمتی اضافہ ہوتا جو یادگارِ زمانہ رہتا۔ آپ معاف فرمائیں گے یہ بدترین حق تلفی تھی جو آپ اپنی کر سکتے تھے۔

خود مہدی نے اس مجموعے کا نام ''افاداتِ ناصری'' بھی تجویز کر دیا تھا، مگر مہدی مر گئے اور مجموعہ شائع نہ ہوا۔ اس تجویز کے کوئی بیس سال بعد انصار ناصری اور میں نے ڈرتے ڈرتے میر صاحب سے اجازت چاہی کہ ہم اس خدمت کو انجام دیں۔ میر صاحب اس پر رضامند ہو گئے تھے اور' افاداتِ مہدی'' بھی ان کی نظر سے گزر چکی تھی۔ انصار ناصری نے میر صاحب کی کتاب کا نام' افاداتِ ناصری'' رکھنا چاہا

تو میر صاحب چیں بہ جبیں ہوکر بولے''میں مہدی سے گھٹ کر نہیں رہنا چاہتا۔ میں نے مقامات حریری اور مقاماتِ حمیدی کے وزن پر'مقاماتِ ناصری'سوچا ہے۔''مگر میر صاحب کی علالت کا سلسلہ شروع ہو چکا تھا، وہ انتخابِ مضامین کا کام نہ کر سکے اور پھران کا وقتِ آخر آ پہنچا،ان کے مرنے کے بعد اور بُہتیرے بکھیڑے پھیل گئے۔اور یہ کام رہ ہی گیا۔

میر صاحب وضعدار ایسے تھے کہ ساری عمران کے لباس میں کوئی فرق نہیں آیا۔''صلائے عام''۵۲ سال جاری رہا، پہلا پرچہ جس کاتب نے لکھا تھا آخر کے پرچے تک وہی کتابت کرتا رہا۔ پریس مین بھی شروع سے آخر تک ایک ہی رہا۔آخر آخر میں''صلائے عام'' کی اشاعت جب بہت کم ہوگئی تو صرف سوسوا سو پرچے چھپتے اور قدردانوں میں تقسیم ہوجاتے۔میر صاحب اس کے لیے دوسو روپے ماہوار آخر تک دیتے رہے اور پرچہ بند کرنے کو اپنی وضعداری کے خلاف سمجھتے رہے۔اپنے کسی پرچے میں کبھی کوئی اشتہار نہیں چھپا۔روزانہ شام کو جامع مسجد کا پھیرا ضرور ہوتا تھا۔جب تک ان کے دوست احباب جیتے رہے ان سے ملنے اور بازدید کے لیے جاتے رہے۔نماز پابندی سے نہیں پڑھتے تھے مگر جب پڑھتے تو بڑے خضوع وخشوع کے ساتھ۔کبھی کبھی یوں ہی سجدے میں پڑ جاتے۔عید، بقرعید کے موقع پر گھر کے سب چھوٹے بڑوں کو جمع کر کے عیدگاہ ضرور جاتے تھے۔آخری بقرعید کے موقع پر سخت تکلیف میں مبتلا تھے مگر عیدگاہ جا کر ہی نماز ادا کی۔عید کے دن خاندان کے کل افراد کو دوپہر کے کھانے پر جمع کرتے تھے۔

میر صاحب کو برش سے دانت مانجھنے کی عادت تھی۔ایک ایک کر کے سب دانت رخصت ہوگئے۔آخر میں صرف ایک دانت رہ گیا تھا۔ اس کے لیے بھی برش اور کریم کا اہتمام کرتے تھے۔

میر صاحب کو ہزاروں شعر یاد تھے۔شعر کا برجستہ مصرف ان سے بہتر کہیں اور نہیں دیکھا۔لکھنے میں بھی شعر بہت لکھتے اور بولنے میں بھی بات بات پر شعر پڑھتے تھے۔جب حبس بول کی شکایت بڑھ گئی تو میر صاحب زندگی سے مایوس ہوگئے تھے۔فرماتے تھے

ختم ہی سمجھو زندگی کے دن　　کچھ ورق اور ہیں فسانے کے

انتقال سے چار دن پہلے کا واقعہ ہے کہ مرض الموت کی شدت میں مبتلا تھے۔ضعف سے آنکھ نہ کھلتی تھی۔ان کے صاحب زادے نے دل بہلانے کے لیے کہا''دیکھیے آپ کے بیٹے بیٹیاں، پوتے پوتیاں،نواسے نواسیاں،سب آپ کی خدمت کے لیے جمع ہیں۔کیا انہیں دیکھ کر آپ کو خوشی نہیں ہوتی؟''متبسم ہوکر بولے

ہو غم ہی جاں گداز تو غم خوار کیا کرے؟

مرنے سے کچھ دیر پہلے جب ان سے پوچھا گیا کہ آپ کی طبیعت کیسی ہے؟ تو فرمایا

سفینہ جب کہ کنارے پہ آ لگا غالبؔ

خدا سے کیا ستم وجورِ ناخدا کہیے!

میر صاحب کی آخری آرزو ان کے ایک خط میں درج ہے۔یہ خط انہوں نے اپنے بیٹے انتصار علی صاحب کو لکھا تھا۔

خط کی نقل حاصل کر کے درج کی جاتی ہے:

''بیٹا

میری ایک آرزو یہ ہے کہ کتب خانے والا مکان تکلف سے آراستہ ہوجائے،اور میں دن رات وہیں پڑا رہوں۔تم اگر ساتھ چائے پینے آجاؤ تو کیا کہنا مگر کوئی معمولی ذکر کسی کا نہ ہو۔کھانا، جب مجھے بھوک لگے پکا پکایا مل جائے،اور کوئی لڑکی آ کر کھلا جائے۔کوئی نایاب کتاب یا چیز نظر آئے تو مجھے اتنا مقدور ہو کہ فوراً خرید لوں۔رات کو بے فکر سوؤں اور صبح خوش اٹھوں۔کوئی مسئلہ فلاسفی کا جو سمجھ میں نہ آتا ہو اسے سمجھ لوں اور دوسروں کو سمجھا سکوں۔دُنیا کی جتنی کتابیں دل ودماغ کو خوش کر سکیں سب میرے پاس ہوں۔جاڑے میں انگیٹھی ہو اور گرمی میں برف۔برسات میں کمرے کے اندر بیٹھا ہوں اور وہ ٹپکتا نہ ہو۔رات کو جلانے کے واسطے خوب صورت STICK CANDLE کی روشنی ہو،اور جو کتاب مجھے پسند ہو وہ میرے سامنے ہو۔تم اتنا سامان میرے لیے کر دو تو I will Die Happy''۔

یہ نفیس مزاج انسان 1933 میں ہم سے رخصت ہوگیا، سیمابؔ اکبرآبادی نے ''میرناصر علی خاں'' سے تاریخِ وفات 1335 نکالی۔(ماخذ:چندادبی شخصیتیں)

4.2.2 میرناصرعلی کا فنی تجزیہ

شاہداحمد دہلوی کا مجموعہ چندادبی شخصیتیں اردو خاکہ نگاری کی ایک اہم کتاب ہے،جس میں انہوں نے اپنے عہد کے بڑے ادیبوں اور فنکاروں منٹو،جگر، جوش،عظیم بیگ چغتائی،استاد بندوخاں اورخواجہ حسن نظامی وغیرہ کونہایت برجستہ اور جاندار اسلوب میں پیش کیا ہے۔انہی خاکوں میں ''میرناصرعلی'' بھی شامل ہے،جس میں دہلوی نے ایک تہذیب یافتہ،منکسرالمزاج اورعلم دوست شخصیت کو فنّی بصیرت کے ساتھ مجسم کردیا ہے۔میرناصرعلی دہلوی ایک تہذیب یافتہ،کم گو،سنجیدہ،نہایت متواضع اورادبی ذوق رکھنے والی شخصیت تھے۔وہ دہلی کی علمی وادبی محفلوں میں اپنی متانت،شرافت اورشائستگی کے سبب خاص مقام رکھتے تھے۔

شاہداحمد دہلوی کا یہ خاکہ اپنی فنی خوبیوں،اسلوب کی شگفتگی اور کردارنگاری کی مہارت کے سبب نمایاں حیثیت رکھتا ہے۔دہلوی نے اس خاکے میں میرناصرعلی کے ظاہری خدوخال سے زیادہ ان کی شخصیت کے باطنی رنگوں کونمایاں کیا ہے،جوفن خاکہ نگاری کا بنیادی تقاضا ہے۔تحریر کی پہلی ہی سطر سے قاری کواندازہ ہوجاتا ہے کہ یہ ایک ایسے شخص کا خاکہ ہے جو بظاہر خاموش طبع ہے،مگراس کی خاموشی میں تہذیب،وقاراور گہری انسان دوستی پوشیدہ ہے۔

اس خاکے کی سب سے نمایاں خوبی کردارنگاری میں نفاست ہے۔دہلوی نے نہ غیرضروری واقعات کا سہارا لیااور نہ مبالغہ آرائی کی بلکہ چندمختصرلیکن مؤثر اشاروں سے میرناصرعلی کی پوری شخصیت سامنے رکھ دی۔ان کی نشست وبرخاست،گفتگو کا انداز،مزاج کی سنجیدگی اور ان کے نرم مزاج کوایسی چابکدستی سے پیش کیا گیا ہے کہ قاری کے ذہن میں ایک مکمل اور جاندار تصویر بن جاتی ہے۔

شاہد دہلوی کا اسلوب سادہ،شگفتہ اور تہذیبی لطافت سے بھرپور ہے۔جملے چھوٹے،رواں اور مکالمے برجستہ ہیں۔تحریر میں دہلی کی تہذیب،زبان کی مٹھاس اور گفتگو کی نزاکت پوری طرح جھلکتی ہے۔طنزومزاح کی ہلکی پھلکی لہرتحریر کوخوش ذائقہ بناتی ہے،مگرکہیں بھی بے ادبی یا تیزی نہیں آتی۔یہی اعتدال دہلوی کے اسلوب کوفنی وقارعطا کرتا ہے۔

خاکہ تاثر آفرینی کے حسن سے بھی مالامال ہے۔پڑھنے والا جب خاکہ ختم کرتا ہے تو اس کے ذہن میں ایک ایسے شریف النفس،علم دوست،تہذیب یافتہ اورمنکسرالمزاج انسان کا پورا نقشہ قائم ہوچکا ہوتا ہے،جوفن خاکہ نگاری کے لیے کامیابی کی علامت ہے۔دہلوی نے زندگی کے لمحوں کو واقعہ نہیں، بلکہ کیفیت بنا کرپیش کیا ہے،جس سے خاکہ زندگی کے بہت قریب محسوس ہوتا ہے۔اس کے علاوہ اس خاکے میں مزاح اورظرافت کا ایک خاص رنگ بھی موجود ہے۔میرناصرعلی کی گفتگو،ان کے لطیف جملے،اورموقع محل کے مطابق طنزیہ انداز نہ صرف قاری کومحظوظ کرتے ہیں بلکہ ان کی ذہانت اور حاضر جوابی کوبھی نمایاں کرتے ہیں۔مثال کے طور پران کے بعض جملے ایسے ہیں جو بظاہر سادہ معلوم ہوتے ہیں مگراپنے اندر گہرا طنز اور معنی رکھتے ہیں۔یہ مزاح کہیں بھی بھونڈا یا سطحی نہیں بلکہ تہذیبی شائستگی کے دائرے میں رہتے ہوئے پیش کیا گیا ہے،جو دہلوی کے فن کا خاص امتیاز ہے۔اس کے ساتھ ساتھ دہلوی نے میرناصرعلی کی علمی عظمت اور مطالعہ کے شوق کوبھی نمایاں کیا ہے۔وہ نہ صرف اردو بلکہ فارسی اورانگریزی ادب پربھی گہری نظر رکھتے تھے۔ان کا کتب خانہ،نادر کتابوں سے محبت اورعلمی گفتگو کا انداز اس بات کی دلیل ہے کہ وہ ایک ہمہ جہت شخصیت کے مالک تھے۔دہلوی نے ان کے اس علمی پہلوکونہایت خوبصورتی سے اجاگر کیا ہے،جس سے قاری کوان کی ذہنی وسعت کا اندازہ ہوتا ہے۔

خاکے میں ایک اوراہم پہلو میرناصرعلی کی شخصیت کے تضادات ہیں،جنہیں دہلوی نے بڑی مہارت سے پیش کیا ہے۔ایک طرف وہ نہایت منکسرالمزاج،سادہ اور بے نیاز نظر آتے ہیں،تو دوسری طرف اپنی رائے میں مضبوط،خوددار اور بعض اوقات قدرے سخت مزاج بھی دکھائی دیتے ہیں۔یہی تضادات ان کی شخصیت کو دلچسپ اور حقیقی بناتے ہیں، کیونکہ ایک جیتی جاگتی شخصیت میں یہی رنگ پائے جاتے ہیں۔اس خاکے میں دہلی کی تہذیب وثقافت کی جھلک بھی نمایاں ہے۔رہن سہن،لباس،محفلوں کا انداز،علمی نشستیں،مشاعرے

اور روزمرہ کی گفتگو یہ سب عناصر مل کر ایک ایسے عہد کی تصویر پیش کرتے ہیں جو اب قصہ ؟ پارینہ بن چکا ہے۔ دہلوی نے نہایت خوبصورتی سے اس تہذیبی فضا کو اپنے خاکے میں سمو دیا ہے، جس سے یہ تحریر محض ایک شخصیت کا بیان نہیں رہتی بلکہ ایک پورے معاشرے کی عکاسی بن جاتی ہے۔ دہلوی کا مشاہدہ نہایت گہرا اور باریک بین ہے۔ وہ چھوٹی چھوٹی باتوں سے بڑی حقیقتیں اخذ کر لیتے ہیں۔ مثلاً میر ناصر علی کی عادات، ان کے روزمرہ کے معمولات، لوگوں سے برتاؤ اور ان کی گفتگو کے انداز سے وہ ان کی پوری شخصیت کا نقشہ کھینچ دیتے ہیں۔ یہی خصوصیت ایک کامیاب خاکہ نگار کی پہچان ہوتی ہے۔

خاکہ نگاری میں توازن اور اعتدال بھی بہت اہم ہوتا ہے، اور دہلوی نے اس کا بھرپور لحاظ رکھا ہے۔ انہوں نے نہ تو حد سے زیادہ تعریف کی ہے اور نہ ہی غیر ضروری تنقید کی۔ بلکہ انہوں نے ایک حقیقت پسندانہ اور معتدل انداز میں میر ناصر علی کی شخصیت کو پیش کیا ہے، جس سے تحریر میں صداقت اور خلوص پیدا ہو گیا ہے۔ مجموعی طور پر ''میر ناصر علی'' ایک کامیاب اور مکمل خاکہ ہے جو شاہد احمد دہلوی کی فنی مہارت، مشاہدے کی گہرائی، زبان کی صفائی اور تہذیبی شعور کا حسین نمونہ پیش کرتا ہے۔ انہوں نے ایک سادہ مگر باوقار، علم دوست اور منفرد شخصیت کو نہایت محبت، ہمدردی اور فنکاری کے ساتھ پیش کیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ یہ خاکہ نہ صرف قاری کو متاثر کرتا ہے بلکہ اسے ایک دیرپا تاثر بھی عطا کرتا ہے۔ اس طرح یہ تحریر اردو ادب میں خاکہ نگاری کی ایک عمدہ مثال کے طور پر اپنی اہمیت برقرار رکھتی ہے۔

خود اکتسابی کے لیے سوالات I

ایک جملے میں جواب لکھیں۔

1۔ شاہد احمد دہلوی ڈپٹی نذیر احمد ۔۔۔۔۔ کے تھے۔

2۔ شاہد احمد دہلوی کی کتاب چند ادبی شخصیات ۔۔۔۔۔ کا مجموعہ ہے۔

3۔ ماہنامہ ساقی کا اجرا ۔۔۔۔۔ میں کیا۔

4۔ شاہد احمد دہلوی کا انتقال ۔۔۔۔۔ میں ہوا۔

5۔ تیرہویں صدی بند ہونے کے بعد انہوں نے ۔۔۔۔۔ زمانہ شائع کیا۔

6۔ انہوں نے اپنا ہینڈ پریس قائم کیا تھا جس کا نام ۔۔۔۔۔ رکھا تھا۔

7۔ سر سید احمد خاں میر ناصر علی کو از راہ شفقت ۔۔۔۔۔ لکھتے تھے۔

4.2.3 زبان کی مہارتیں بولنا

بولنا زبان کی بنیادی مہارتوں میں سے ایک اہم مہارت ہے۔ انسان اپنے خیالات، احساسات اور معلومات کو بول کر دوسروں تک پہنچاتا ہے۔ اچھی گفتگو نہ صرف شخصیت کو نکھارتی ہے بلکہ انسان کے علمی ذوق اور تہذیبی شعور کی بھی نمائندگی کرتی ہے۔ شاہد احمد دہلوی کے لکھے ہوئے خاکے ''میر ناصر علی'' میں ہمیں گفتگو کی اسی خوبصورتی اور اہمیت کا حقیقی نمونہ ملتا ہے۔

میر ناصر علی علم و ادب کے شائق، خوش گفتار، شائستہ مزاج اور سنجیدہ تہذیبی پس منظر رکھنے والے شخص تھے۔ ان کی بات کرنے کا انداز اتنا نپا تلا اور دل آویز تھا کہ محفل میں موجود ہر شخص انہیں توجہ سے سنتا تھا۔ ان کے جملوں میں تہذیبِ دہلی کی مٹھاس، دلیل کی مضبوطی اور زبان کی صفائی جھلکتی تھی۔ ان کی گفتگو غلطی سے پاک ہوتی تھی اور وہ غلط اردو پر فوراً ٹوکتے تھے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ درست زبان کا استعمال بولنے میں بنیادی حیثیت رکھتا ہے۔

اس خاکے سے پتہ چلتا ہے کہ بولنا صرف الفاظ بول دینا نہیں بلکہ سوچ سمجھ کر، مناسب الفاظ کے ساتھ، شائستگی اور دلیل کے ساتھ گفتگو کرنا ہی اصل مہارت ہے۔ گفتگو میں نشست و برخاست، آواز کا اتار چڑھاؤ اور لہجے کی نرمی بھی اہم کردار ادا کرتے ہیں۔ میر ناصر علی کی مثال سے طلبہ سیکھتے ہیں کہ خوش گفتاری انسان کے وقار کو بڑھاتی ہے اور لوگوں میں اس کی عزت میں اضافہ کرتی ہے۔

زبان کی دوسری مہارتیں سننا، پڑھنا اور لکھنا بھی گفتگو کو بہتر بنانے میں مدد دیتی ہیں۔ مطالعہ انسان کے ذہن کو وسعت دیتا ہے، سننے کی عادت سمجھ داری پیدا کرتی ہے، اور لکھنے کی مشق الفاظ کے درست استعمال میں معاون ہوتی ہے۔ اسی لیے بولنا زبان کی چاروں مہارتوں سے جڑا ہوا ہے اور ایک مکمل زبان سیکھنے والے کے لیے نہایت ضروری ہے۔ آخر میں یہ حقیقت سامنے آتی ہے کہ بولنے کی مہارت شخصیت کا آئینہ ہے۔ جو شخص خوبیِ گفتار رکھتا ہے وہ نہ صرف دوسروں کو متاثر کرتا ہے بلکہ سماجی اور تعلیمی دونوں سطحوں پر کامیابی حاصل کرتا ہے۔ میر ناصر علی کا طرزِ گفتگو طلبہ کے لیے ایک روشن مثال ہے کہ زبان کو کیسے خوشگوار، مؤثر اور باوقار انداز میں استعمال کیا جائے۔

4.2.4 قواعد

مفعول وہ ہے جو کام (فعل) کا اثر قبول کرے۔ یعنی جملے میں فعل کا اثر جس پر واقع ہوا سے مفعول کہتے ہیں۔ مثلا

احمد نے کتاب پڑھی۔

علی نے کھانا کھایا۔

بچے نے دروازہ کھولا۔

ان تینوں مثالوں میں کھانا، کتاب اور دروازہ مفعول ہے۔

محاورہ کی تعریف: (Idioms)

وہ مخصوص اور رواں فقرہ یا اظہار ہے جس کا مفہوم لفظی معنی سے ہٹ کر ایک طے شدہ اور غیر لفظی (اصطلاحی) معنی رکھتا ہو۔ یہ ایسے جملے ہوتے ہیں جو کثرتِ استعمال سے ایک خاص معنوی شان حاصل کر لیتے ہیں اور اپنی اصل ترکیب کے ساتھ ہی سمجھ آتے ہیں۔ جیسے ہاتھ پاؤں پھول جانا۔ آسمان سر پر اٹھا لینا۔ دانت کھٹے کرنا وغیرہ۔

روزمرہ کی تعریف:

وہ الفاظ یا الفاظ کا مجموعہ جو اہل زبان روزمرہ کی گفتگو میں حقیقی معنوں میں استعمال کرتے ہیں۔ جیسے آئے دن، بلا ناغہ، آتے ہی، ہر وقت وغیرہ۔

میر ناصر علی کے متن کو طلبہ کے لیے نہ صرف اردو ادب کے تاریخی اور ادبی حوالے سے اہم سمجھا جاتا ہے بلکہ یہ قواعدی مطالعہ کے لیے فعل کا اثر براہِ راست کسی چیز یا شخص پر ظاہر ہوتا ہے۔ طلبہ یہاں سے سیکھ سکتے ہیں کہ مفعول کس طرح جملے میں فعل کے اثر کو قبول کرتا ہے اور جملے کے فہم کو واضح بناتا ہے۔ مثال کے طور پر:

کتابیں:

ہم یہ کرتے تھے کہ عرب سرا آنے جانے میں دو کتابیں لے کر چلتے تھے۔

مطبع ناصری:

انہوں نے اپنا ایک ہینڈ پریس لگا لیا اور اس کا نام ''مطبع ناصری'' رکھا۔

مضامین:

نیچریوں کے خلاف اِس دھڑلے سے مضامین لکھے کہ ان کی دھوم مچ گئی۔

مشاعرہ:

کوئی دو گھنٹے ڈھائی گھنٹے یہ مشاعرہ جاری رہتا۔

محاورے کی مثالیں:

خون تھوکنے لگے:

بعض نے کوشش کر کے نقل اتارنی چاہی تو دو فقرے بھی نہ لکھے گئے اور خون تھوکنے لگے۔

بیڑا غرق کرنا:

بس پھر حریف کا جب تک بیڑا غرق نہ کر لیتے انہیں چین نہ آتا۔

آپے سے باہر ہو جانا:

غلط اردو سُن کر میر صاحب آپے سے باہر ہو جاتے تھے۔

دل بہلانا:

بچوں کے بچوں سے ان کا جی بہلتا ہی رہتا تھا۔

منہ لے کر چلے آنا:

وہ بے چارے اپنا سا منہ لے کر وہاں سے چلے آئے۔

وزمرہ کی مثالیں:

آئے دن:

روزانہ عصر کے وقت فراش خانہ سے جامع مسجد تک پیدل جایا کرتے تھے۔

(روزانہ/آئے دن کے مفہوم میں)

بڑی محبت:

میر صاحب کو اپنی بیوی سے بڑی محبت تھی۔

ہمیشہ:

میر صاحب اپنی اولاد کو اپنے سے جُدا ہونے نہیں دیتے تھے۔

اکثر:

مولویوں کا مذاق اکثر اڑاتے تھے۔

ہر وقت:

مطالعہ کی عادت انہیں ساری عمر رہی۔

خود اکتسابی کے لیے سوالات II

صحیح یا غلط کی نشان دہی کیجیے۔

1۔ اچھی گفتگو انسان کی شخصیت اور تہذیبی شعور کی نمائندگی کرتی ہے۔ صحیح/غلط

2۔ میر ناصر علی کی گفتگو میں تہذیبِ دہلی کی مٹھاس اور زبان کی صفائی ظاہر ہوتی تھی۔ صحیح/غلط

3۔ گفتگو کے دوران لہجے کی نرمی اور آواز کا اتار چڑھاؤ غیر ضروری عناصر ہیں۔ صحیح/غلط

4۔ سننا، پڑھنا اور لکھنا یہ تینوں مہارتیں بولنے کو بہتر بنانے میں مدد کرتی ہیں۔ صحیح/غلط

5۔ جملے میں فعل کا اثر جس پر واقع ہوا سے مفعول کہتے ہیں۔ صحیح/غلط

6۔ احمد نے کتاب پڑھی میں احمد مفعول ہے۔ صحیح/غلط

7۔ علی نے کھانا کھایا میں کھانا مفعول ہے۔ صحیح/غلط

8۔ محاورہ ایسے الفاظ ہوتے ہیں جو ہمیشہ لفظی معنوں میں استعمال ہوتے ہیں۔ صحیح/غلط

9۔ آئے دن اور بلا ناغہ روزمرہ کی مثالیں ہیں۔ صحیح/غلط

10۔ آتے ہی اور ہر وقت محاورے کی مثال ہیں۔ صحیح/غلط

11۔ روزمرہ ہمیشہ حقیقی معنوں میں استعمال ہوتے ہیں، مجازی نہیں۔ صحیح/غلط

12۔ سننا، پڑھنا اور لکھنا یہ تینوں مہارتیں بولنے کو بہتر بنانے میں مدد کرتی ہیں۔ صحیح/غلط

4.3 الفاظ اور معنی

الفاظ	معنی
شائق	شوق رکھنے والا
خوش گفتار	اچھے انداز سے بات کرنے والا
شائستہ مزاج	تہذیب والا، مؤدب
دل آویز	دل کو بھانے والا
وقار	عزت، مقام
وسعت	پھیلاؤ، بڑھا ہوا ذہنی دائرہ
معاون	مددگار
باوقار	عزت والا، شاندار
وضع دار	تہذیب و شرافت والا، با اخلاق
پوپلا منہ	جس کے منہ میں دانت نہ ہوں
سرو قد	لمبا، سیدھا قد
وضعِ قلندرانہ	درویشانہ انداز
وائلہ	گرم کپڑا، خاص طور پر جاڑوں کا
سخن گسترانہ شوخیاں	طنزیہ یا چبھتی باتیں
دلِ صد پارہ	بہت بکھرا ہوا دل
پاداش	سزا، نتیجہ
معقولات	عقلی علوم
منقولات	روایتی/نقلی علوم
سخن سنج	شعر و ادب کی باریکی سمجھنے والا

4.4 خود اکتسابی سوالات کے جوابات

I

1۔ پوتے

2۔ خاکوں

3۔ 1930

4۔ 1967

5۔ زمانہ
6۔ ناصری پریس
7۔ میرے نالائق

II

1۔ صحیح
2۔ صحیح
3۔ غلط
4۔ صحیح
5۔ صحیح
6۔ غلط
7۔ صحیح
8۔ غلط
9۔ صحیح
10۔ غلط
11۔ صحیح
12۔ صحیح

4.5 خلاصہ

اس اکائی میں شاہد احمد دہلوی کے لکھے ہوئے معروف خاکہ ''میر ناصر علی'' کو شامل کیا گیا ہے، جس کے مطالعے سے طلبہ کو زبان کی ایک نہایت اہم مہارت بولنا سمجھائی گئی ہے۔ بولنا محض الفاظ ادا کرنے کا نام نہیں بلکہ خیالات، احساسات اور معلومات کو مؤثر، شائستہ اور باوقار انداز میں دوسروں تک پہنچانے کا فن ہے۔ اچھی گفتگو انسان کی شخصیت کو نکھارتی ہے، اس کے تہذیبی شعور کی نمائندگی کرتی ہے اور سماجی وقار میں اضافہ کرتی ہے۔ شاہد احمد دہلوی اردو ادب کے ممتاز ادیب، مدیر، مترجم اور صاحب طرز خاکہ نگار تھے۔ ان کی نثر میں تہذیبی رنگ، دلکشی، سادگی اور فکری سنجیدگی نمایاں ہے۔ ان کے خاکوں میں دہلی کی تہذیب و زبان کی لطافت، کرداروں کی گھلاوٹ اور انسانی رویّوں کا حقیقت پسندانہ بیان ملتا ہے۔ انہی خصوصیات کے ساتھ وہ میر ناصر علی جیسے باوقار، شائستہ اور خوش گفتار شخصیت کا نقشہ اس خاکے میں پیش کرتے ہیں۔

خاکہ "میر ناصر علی" کے مطالعے سے طلبہ کو گفتگو کی اصل روح سمجھ میں آتی ہے۔ میر ناصر علی خوش گفتار، دلیل سے بات کرنے والے، تہذیبی آداب کے پابند اور صاف ستھری زبان استعمال کرنے والے شخص تھے۔ ان کی گفتگو میں نرمی، وضاحت، دلیل اور تہذیبی مٹھاس پائی جاتی تھی۔ وہ غلط اردو برداشت نہیں کرتے تھے، جس سے یہ سبق ملتا ہے کہ درست زبان کا استعمال بولنے میں بنیادی اہمیت رکھتا ہے۔ اس طرح طلبہ سیکھتے ہیں کہ اچھی گفتگو الفاظ کا بے ترتیبی سے استعمال نہیں بلکہ سمجھداری، شائستگی اور زبان کی صفائی کے ساتھ اپنا مدعا پیش کرنا ہے۔ اس اکائی میں زبان کی دیگر مہارتوں سننا، پڑھنا اور لکھنا کی اہمیت بھی بیان کی گئی ہے، جو گفتگو کو بہتر اور زیادہ بامعنی بنانے میں مدد دیتی ہیں۔ سن کر سمجھنے کی عادت، مطالعے سے ذہنی وسعت اور لکھنے کی مشق الفاظ کے درست استعمال کا شعور پیدا کرتی ہے۔ یوں بولنا چاروں مہارتوں کے باہمی ربط سے ایک مکمل اور مؤثر صورت اختیار کرتا ہے۔

اکائی کے قواعدی حصے میں مفعول کی واضح تعریف اور مثالیں فراہم کی گئی ہیں تا کہ طلبہ جملوں میں اس کی پہچان کر سکیں۔ مزید یہ کہ قواعد کی عملی مشق کے لیے جملے دیے گئے ہیں جن میں طلبہ اسم، فعل یا دیگر قواعدی عناصر کی شناخت کریں گے۔ اسی طرح اردو سے انگریزی اور انگریزی سے اردو ترجمہ کرنے کے لیے بھی مختصر جملے شامل کیے گئے ہیں، جن کا مقصد زبان کے عملی استعمال، فہم اور ترسیلی صلاحیت کو مضبوط بنانا ہے۔ آخر میں طلبہ کی خود اکتسابی (Self Learning) کے لیے سوالات اور سرگرمیاں رکھی گئی ہیں تا کہ وہ خود اپنی سمجھ کی جانچ کر سکیں اور قواعد، گفتگو کی خوبیوں اور متن کے اہم نکات کو مزید واضح کر سکیں۔ مجموعی طور پر اکائی 4 طلبہ کو نہ صرف بولنے کی تہذیبی، علمی اور سماجی اہمیت سیر وشناس کراتی ہے بلکہ درست زبان، قواعد کی پہچان، ترجمے کی مشق اور مؤثر اظہارِ خیال کی مہارتیں بھی سکھاتی ہے۔ یہی اس اکائی کا بنیادی مقصد اور تعلیمی حاصل ہے۔

4.6 خود اکتسابی کے لیے مشق:

تحریری سرگرمیاں: دیے گئے پیراگراف میں اسم، ضمیر، صفت، فعل، فاعل، مفعول، محاورے اور روزمرہ کی شناخت کریں۔

میر صاحب کا کتب خانہ ایک زمانے میں دلّی کے بہترین کتب خانوں میں شمار ہوتا تھا۔ یوں تو اس میں تمام علوم کی کتابیں تھی مگر تاریخ، ادب اور فلسفہ کی کتب کا ذخیرہ بے مثل تھا۔ افسوس کہ اس کتب خانے کی بہار ان کی زندگی ہی میں لٹ چکی تھی۔ اس کی بیش بہا کتب چوری ہو کر کوڑیوں کے مول ردّی خریدنے والے کباڑیوں میں پہنچتی رہیں۔ میر صاحب اکثر اپنی کتابیں چوک سے دوبارہ خرید لایا کرتے تھے پھر وہ اپنے لُٹنے پر قانع ہو گئے تھے۔ ان کے انتقال کے وقت بھی ان کے لٹے گھٹے کتب خانہ میں چار ہزار کتابیں تھیں جو ان کے ورثا میں تقسیم ہو گئیں اور ان کا کتب خانہ سخی کے دل کی طرح صاف ہو گیا۔ نوادر جمع کرنے کا بھی میر صاحب کو شوق تھا۔ کتب خانے کا ایک حصہ عجائب خانہ بنا ہوا تھا۔ اس میں قلمی تصویریں، خطاطی کے نمونے، قطعات، دست کاری کے اعلیٰ نمونے، تاریخی نوادر، قلمی کتابیں، سکے اور بعض بے حد قیمتی چیزیں شامل تھیں۔

کام کا تجربہ: دیے گئے جملوں کا انگریزی میں ترجمہ کریں۔

1۔ تاج محل آگرہ میں ہے۔
2۔ وقت گزرتے دیر نہیں لگتی۔
3۔ سچ بولنا اچھی عادت ہے۔
4۔ تم کبھی وقت پر نہیں آتے۔
5۔ راشد نے مجھے اچھی خبر سنائی۔
6۔ وہ لڑکا جو کل آیا تھا میرا بھائی ہے۔
7۔ فاطمہ نے اپنے والد کو خط لکھا۔
8۔ میں نے اس کی بات پر کان نہیں دھرے۔
9۔ احمد نے اس کی مدد کی۔
10۔ یہ کتاب بہت دلچسپ ہے۔
11۔ عائشہ اسکول گئی وہ بہت محنتی طالبہ ہے۔
12۔ محنت کا پھل میٹھا ہوتا ہے۔

13۔ کس نے دروازہ کھٹکھٹایا۔

4.7 مشقی سوالات

1۔ شاہد احمد دہلوی کی زندگی اور ادبی خدمات پر روشنی ڈالیے۔؟
2۔ خاکہ ''میر ناصر علی'' کا فنی تجزیہ تحریر کیجیے۔؟
3۔ زبان کی مہارت ''بولنا'' پر اس خاکے کے حوالے سے تفصیل سے نوٹ لکھیں۔؟
4۔ مفعول کی تعریف مع مثالیں تحریر کیجیے اور جملوں میں اس کی پہچان واضح کیجیے۔؟
5۔ متن کے مطابق گفتگو میں درست زبان کے استعمال کی اہمیت واضح کیجیے۔؟
6۔ زبان کی چار مہارتوں سننا، بولنا، پڑھنا، لکھنا کے باہمی ربط پر نوٹ لکھیں۔؟
7۔ شاہد احمد دہلوی کے اسلوب نگارش کے نمایاں اوصاف تحریر کیجیے۔؟

4.7 مزید مطالعے کے لیے کتب

1۔ شاہد احمد دہلوی حالات و آثار، ڈاکٹر محمد عارف، انجمن ترقی اردو پاکستان 2000
2۔ چند ادبی شخصیتیں، شاہد احمد دہلوی، موڈرن پبلشنگ ہاوس دہلی 1983
3۔ اردو نثر کا فنی ارتقا، ڈاکٹر فرمان فتح پوری، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاوس دہلی 2013
4۔ اردو زبان و قواعد، حصہ دوم شفیع احمد صدیقی، ادارہ ادبیات اردو حیدر آباد 1991